جماعتِ اسلامی ہند

پس منظر، خدمات اور طریقۂ کار

مولانا سید جلال الدین عمری

ترتیب

دعوتی، اصلاحی اور رفاہی خدمات ۲۹

طریقۂ اصلاح و تربیت ۴۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

جماعت اسلامی ہند ہمارے اس ملک کی ایک معروف دینی جماعت ہے۔اس کا باقاعدہ دستور اور متعین پالیسی ہے۔ اس کی پشت پر وسیع لٹریچر ہے۔ اس کی دعوت عام ہورہی ہے۔ خاص طور پر پڑھا لکھا ایک طبقہ اس سے واقف بھی ہے اور متاثر بھی۔ ملک وملت کے لیے اس کی خدمات بھی باخبر افراد سے مخفی نہیں ہیں۔ وہ اپنے تمام کام ملکی آئین اور دستور کے تحت انجام دیتی ہے۔ جماعت کے مختلف علمی اور عملی پہلوؤں پر ماہ نامہ زندگی نو کے ادارتی صفحات میں مجھے کبھی کبھی اظہار خیال کا موقع ملتا رہا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے مضامین یا اداریے پسند کیے گئے اور بعض رسائل میں نقل بھی ہوئے۔ خیال ہوا کہ ان کو یکجا شائع کردیا جائے، تاکہ جن لوگوں کے پاس جماعت کے وسیع لٹریچر کے مطالعہ کا وقت نہیں ہے یا جو اس کی خدمات اور طریقۂ کار سے پوری طرح واقف نہیں ہیں وہ ان سے کسی قدر واقف ہوجائیں۔ ان میں سے ہر مضمون کے آخر میں اس کا ماہ وسالِ اشاعت دے دیا گیا ہے۔ لیکن ان مضامین کو جوں کا توں ماہ نامہ زندگی نو سے اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ان میں جگہ جگہ حذف و اضافہ اور ترمیم کی گئی ہے۔ اس سے امید ہے کہ پیش نظر مقصد بہتر طریقہ سے پورا ہوگا اور ان کی افادیت بڑھ جائے گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور اخلاصِ نیت اور حسنِ عمل کی دولت سے نوازے۔

جلال الدین عمری
یکم جنوری ۱۹۹۴ء

طبع ہفتم

مضامین کا یہ مجموعہ اس سے پہلے چھ مرتبہ شائع ہوچکا ہے۔ اسے جماعت اسلامی ہند کے مقصدِ قیام، اس کی دعوتی ، اصلاحی اور تربیتی خدمات اور طریقۂ کار کو سمجھنے میں مفید سمجھا گیا۔ اب کی بار کسی قدر نظرثانی کے بعد اس کی اشاعت عمل میں آرہی ہے۔ میں برادرم ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ان مضامین پر ذیلی عنوانات قائم کردیے جس سے بہ یک نظر اس کے موضوعات سامنے آجاتے ہیں۔ انھوں نے توجہ سے اس کی پروف ریڈنگ بھی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ کتاب کا یہ نیا ایڈیشن پہلے سے بہتر معیار سے شائع ہورہا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے مزید مقبولیت سے نوازے اور جماعت اسلامی ہند کے تعارف میں وہ اور زیادہ کارآمد ثابت ہو۔

جلال الدین عمری

۴ر جولائی ۲۰۱۳ء

جماعتِ اسلامی۔ قیام کا پس منظر

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری دین ہے۔ اللہ کا یہ دین ہر پہلو سے اور پوری طرح مکمل ہے اور رہتی دنیا تک کے لیے ہے۔ اس میں کسی کمی بیشی یا حذف و اضافہ کا تا قیامت کسی کو حق نہیں ہے۔ جماعت اسلامی اپنے ہر کام میں اسی سے رہ نمائی حاصل کرتی ہے۔ وہ ان ہی باتوں پر زور دیتی ہے جن پر اسلام نے زور دیا ہے اور اتنا ہی زور دیتی ہے جتنا اسلام نے دیا ہے۔ جس عمل کو اسلام نے جتنی اہمیت دی ہے وہ اس کے نزدیک اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے اور جس کام کو اسلام نے اہمیت نہیں دی ہے، اس کے نزدیک بھی اس کی اہمیت نہیں ہے۔ وہ اسلام کو اس کی اسی کامل شکل میں قائم اور غالب کرنا چاہتی ہے۔ یہی اس کا نصب العین ہے اور یہی اس کی تمام کوشش اور جدوجہد کا مرکز ومحور ہے۔

جماعت کے زمانۂ قیام میں رائج فلسفے

۲۶/اگست ۱۹۴۱ء کو جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت پوری دنیا میں مغرب کے افکار کا غلغلہ تھا۔ حق وہ تھا جسے مغرب کی زبان حق کہے اور جسے وہ باطل قرار دے اس کے باطل ہونے کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت نہ تھی۔ خود ہمارے ملک پر بھی یہی نظریات چھائے ہوئے تھے۔ ان سب نظریات کی بنیاد

الحاد پر تھی، جو پہلے ہی قدم پر خدا، رسول اور آخرت کا انکار کر کے آگے بڑھتا ہے۔ اس کے بطن سے تین بڑے فلسفے ابھرے:

ایک فلسفہ تھا قومیت کا۔ اس نے یہ تصور دیا کہ قومیں جغرافیائی حدود، زبان، نسل یا مذہب کی بنیاد پر وجود میں آتی ہیں۔ ایک خاص علاقہ میں رہنے والے یا خاص زبان کے بولنے والے یا خاص نسل یا خاص مذہب سے تعلق رکھنے والے ایک وحدت ہیں۔ وہ دوسروں سے الگ اور آزاد ہیں۔ کسی دوسری قوم کو ان پر حکم رانی کا حق نہیں ہے۔ ان پر خود ان کی مرضی چلے گی اور وہ اپنے معاملات خود طے کریں گے۔

دوسرا فلسفہ جمہوریت کا تھا، جو بتاتا ہے کہ قوموں کی سیاسی طاقت کا مرکز اس کے جمہور ہیں۔ وہی اس کے سیاسی نظام کے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں اور اسے جس رخ پر چاہیں چلا سکتے ہیں۔ انھی کو قانون سازی کا حق ہے۔ جس چیز کو جمہور کی تائید حاصل ہو وہ جائز قانون ہے اور جسے وہ تسلیم نہ کریں وہ ناجائز ہے۔

تیسرا فلسفہ کمیونزم یا سوشلزم کا تھا۔ یہ انسان کی معاشی زندگی کو ایک خاص رخ دیتا ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے پوری انسانی تاریخ معاشی کش مکش کی تاریخ ہے۔ یہ کش مکش محنت اور سرمایہ کے درمیان مسلسل جاری رہتی ہے۔ سرمایہ محنت کا استحصال کرتا ہے اور محنت اپنا حق طلب کرتی ہے۔ اس کش مکش کو ختم کرنے کے لیے اس نے کہا کہ وسائل حیات اور ذرائع پیداوار کچھ افراد کے ہاتھ میں نہ ہوں، بلکہ ان پر ریاست کا کنٹرول ہو اور ریاست ہر فرد کی بنیادی ضروریات فراہم کرنے کی ذمہ دار ہو۔

تحریکاتِ آزادی کا اسلام کے بارے میں موقف

پوری دنیا میں ان ہی نظریات کا چرچا تھا کہ ملک میں آزادی کی تحریک

چلی۔کانگریس اور پھر مسلم لیگ ابھر کر سامنے آئی اور دونوں تحریکیں پورے ملک پر چھا گئیں۔ کانگریس کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھی وہ مغرب کے پروردہ اور مغربی فلسفوں کے دل دادہ تھے۔ آزادی کا تصور بھی انھوں نے مغرب ہی سے لیا تھا اور آزادی کے بعد ملک کی تعمیر بھی مغرب ہی کے فلسفوں کے تحت کرنا چاہ رہے تھے۔

مغرب اس فلسفے پر مطمئن تھا کہ مذہب انسان کا نجی اور پرائیویٹ معاملہ ہے۔ اس کے لیے یہ سوال ہی کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، بلکہ بے معنیٰ تھا کہ سیاسی مسائل میں مذہب سے فتویٰ پوچھا جائے اور اس کی رہ نمائی حاصل کی جائے۔ چنانچہ آزادی کی جنگ اس طرح لڑی جارہی تھی کہ مذہب کسی بھی فرد یا گروہ کا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت نہ تو اس میں مداخلت کرے گی اور نہ وہ حکومت کے معاملات میں دخل دے گا۔

آزادی کی اس تحریک میں مسلمانوں کی جو جماعتیں کانگریس سے قریب تھیں یا اسے تقویت پہنچارہی تھیں انھوں نے سوچا کہ ہندستان میں، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، ان کے لیے سیاسی طور پر یہی ایک راستہ ہے کہ وہ برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر آزادی کی جنگ لڑیں اور کسی مذہب سے اس کا رشتہ نہ جوڑا جائے۔ چناں چہ انھوں نے خوش دلی سے یا سیاسی مجبوریوں اور حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر اس فلسفہ کو عملاً قبول کرلیا تھا کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے ان کے درمیان یہ بات زیر بحث ہی نہیں تھی کہ اسلام کی روشنی میں پوری تحریک کا جائزہ لیا جائے اور اسے اسلامی رُخ دیا جائے۔ پھر یہ سوال تو دور دور تک ان کے نزدیک نہیں پیدا ہوتا تھا کہ آئندہ ملک کا نظام اسلام کی بنیاد پر قائم ہوسکے گا یا نہیں؟ اس کے لیے کسی کوشش کا تو ذکر ہی نہیں۔

جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے وہ مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ ہوم لینڈ

(آزاد مملکت) کا مطالبہ کررہی تھی اس کے لیے وہ اسلام کا بار بار نام بھی لے رہی تھی، لیکن نہ تو اس کے رہ نماؤں کی زندگیاں اسلام کی ترجمانی کر رہی تھیں اور نہ اس کا مجموعی رُخ ہی یہ بتارہا تھا کہ اس کے مطلوبہ ہوم لینڈ میں اسلام کی حکم رانی ہوگی اور اسلامی نظام قائم ہوگا۔

مسلمانوں کے مختلف حلقوں کا اندازِ فکر

بہت سی دینی شخصیتوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ان کے پیشِ نظر غالباً یہ بات تھی کہ مسلمانوں کی ایک الگ مملکت کے وجود میں آنے کے بعد وہاں اسلام کی فرماں روائی ہوگی، لیکن اس کا کوئی واضح تصور ان کے ذہنوں میں نہیں تھا۔

مسلمانوں میں کانگریس اور لیگ سے جو لوگ تعلق رکھتے تھے ان سے ہٹ کر بھی بڑی بڑی مذہبی شخصیتیں تھیں، ادارے تھے اور جماعتیں تھیں۔ ان کے ذریعہ بعض بہت ہی مفید خدمات انجام پارہی تھیں، لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دین کا اجتماعی اور سیاسی شعور امت کے اندر بہت کم زور تھا، اسے بیدار اور مضبوط کرنے کی صحیح معنی میں کسی طرف سے مضبوط اور منظّم کوشش نہیں ہورہی تھی۔

قرآن و حدیث پر نظر رکھنے والا کوئی بھی شخص اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ دین انسان کی پوری زندگی کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور کسی شعبۂ حیات کو آزاد نہیں چھوڑتا، لیکن عملاً دین کو مختلف خانوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ اس کے بعض احکام کی شدت سے پابندی ہورہی تھی اور ان پر زور بھی دیا جاتا تھا، لیکن بعض دوسرے احکام سے غفلت برتی جاتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے مسائل نے وہ اہمیت اختیار کرلی تھی کہ ان کے مقابلہ میں بڑے بڑے احکام کی اہمیت نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ اوراد و وظائف اور نوافل و مستحبات کے چھوٹنے پر تو تنبیہ اور

باز پرس کی جاتی تھی، لیکن معیشت و معاشرت میں بڑی بڑی خلاف ورزیوں کو برداشت کرلیا جاتا تھا۔ سیاست تو جیسے دین کا جزو ہی نہ ہو، اس میں کوئی بھی رویہ اختیار کرنے کی ایک طرح سے آزادی حاصل تھی۔

بعض حلقے ایک خاص دائرہ میں امت کے اندر دینی شعور بیدار کرنے کی کوشش کررہے تھے، لیکن دین کو غالب کرنے کی جدوجہد اس دائرہ میں نہیں آتی تھی۔ وہ حکومت و اقتدار کو اللہ تعالیٰ کا انعام قرار دے کر اس جدوجہد سے دامن بچائے ہوئے تھے اور یہ حقیقت نگاہوں سے اوجھل تھی کہ کسی بھی مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد ضروری ہوتی ہے، اس کے بعد ہی انسان انعام و اکرام کا بھی مستحق ہوتا ہے۔

بہت سے وہ لوگ بھی تھے جن کے نزدیک اسلام تاریخ کا مثالی دور تھا۔ وہ اسے ماضی کے ایک درخشاں باب کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ اس کے فضائل و مناقب کے بیان سے ان کی زبانیں تر رہتی تھیں۔ اس کے پیدا کردہ اخلاق، محبت، عدل و انصاف، قانون و سیاست ہر چیز کے وہ ثناخواں تھے، لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کا احیاء بھی چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ان کی طرف سے کوئی کوشش نظر نہیں آتی تھی۔ یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا کہ آیا وہ اسے آج کے دور میں بھی قابل عمل سمجھتے ہیں یا نہیں؟

مسلمانوں میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں تھی جو اجتماعی معاملات کو مذہب سے آزاد ہی رکھنا چاہ رہے تھے۔ وہ کبھی پلٹ کر بھی یہ دیکھنے کے لیے تیار نہ تھے کہ تہذیب وتمدن اور ریاست و سیاست کے بارے میں اسلام کی کچھ ہدایات بھی ہیں یا نہیں؟ وہ مذہب کو نجی زندگی تک محدود رکھنا چاہ رہے تھے، گو کہ ان کی نجی زندگی بھی بڑی حد تک اس سے آزاد ہوچکی تھی۔

مسلمانوں نے سیکولر طرز کے ادارے بھی قائم کر رکھے تھے اور ان کے خالص دینی ادارے بھی تھے۔ سیکولر اداروں کا مطمح نظر بڑی حد تک قومی اور مادی تھا۔ وہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے سوچنے اور کام کرنے کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ یہ کہنا بھی شاید غلط نہ ہوگا کہ اس طرح کے بہت سے ادارے اسلام کے صحیح تصور ہی سے خالی تھے۔

مسلمانوں کے جو خالص دینی ادارے تھے وہ اس حیثیت سے متعارف تھے کہ وہ قرآن و حدیث کی تعلیم کے مراکز ہیں۔ بعض پہلوؤں سے ان کے ذریعہ امت کو بڑا فائدہ پہنچ رہا تھا۔ یہاں سے مدرسین اور ائمہ، خطباء اور واعظین، مفتی اور قاضی امت کو مل رہے تھے اور ایک خاص دائرہ میں اس کی اصلاح بھی ہو رہی تھی، لیکن یہ ادارے اس بات سے بڑی حد تک بے خبر تھے کہ موجودہ دور میں کن مسائل نے اہمیت اختیار کرلی ہے اور اسلام کو کن پہلوؤں سے چیلنج درپیش ہے۔ ہر ادارہ کسی خاص مسلکِ فقہ کا پابند تھا اور تقلید و عدم تقلید، رفع یدین و عدم رفع یدین جیسے مسائل میں الجھا ہوا تھا اور بنیادی مسائل کی طرف وہ توجہ نہیں تھی جو ہونی چاہیے تھی۔

بعض حلقے تزکیہ و طہارت اور تربیت و اخلاق کی خدمت انجام دے رہے تھے۔اس خدمت کی اہمیت اور عظمت سے کون انکار کرسکتا ہے؟ لیکن اس سے قطع نظر کہ یہ اپنے مقصد میں کس حد تک کام یاب تھے، اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ خدمات امت کے داخلی استحکام کے لیے تھیں۔ یہ خارج کے لیے کوئی نقشۂ کار نہیں فراہم کرتی تھیں۔ کسی زندہ امت کے لیے داخلی استحکام کے ساتھ خارج کے پروگرام کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خارج میں اگر کوئی ہدف نہ ہو تو وہ اپنے خول میں بند ہوجاتی ہے اور دنیا پر چھا جانے کی صلاحیت اس سے ختم ہوجاتی ہے۔

جماعت اسلامی کی فکر کے نمایاں پہلو

ان حالات میں جماعت اسلامی قائم ہوئی۔ جب بھی کوئی تحریک اٹھتی ہے تو اسے حالات کے لحاظ سے فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وقت کے کن افکار و خیالات پر ضرب لگائی جائے اور کن باتوں پر اسے زور دینا اور انھیں نمایاں کرنا چاہیے۔ جماعت اسلامی نے فکری لحاظ سے جن پہلوؤں کو نمایاں کیا ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) اس نے بتایا کہ الحاد مذہب کے خلاف ایک ردعمل کے طور پر ابھرا ہے، اس کے حق میں کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے۔ کائنات کا مشاہدہ، انسان کی عقل اور اس کی فطرت اس کی تردید کرتے ہیں، لہٰذا اس کی بنیاد پر اٹھنے والے تمام فلسفے ایک فریب اور سراب ہیں۔ یہ عمل کے میدان میں بھی ناکام ہوچکے ہیں۔ دنیا ان کا تلخ تجربہ کرچکی ہے اور مسلسل کررہی ہے۔ جو لوگ الحاد کے زیر اثر خدا، رسول اور آخرت کا انکار کرتے بلکہ مذاق اڑارہے تھے ان کے سامنے اسلام کو اس حیثیت سے پیش کیا کہ وہ اللہ کا آخری دین ہے، جو ہماری عقل کو پوری طرح مطمئن کرتا اور ہمارے تمام مسائل کو بہترین طریقہ سے حل کرتا ہے۔

(۲) اسلام کو اللہ تعالیٰ کا دین ماننے کے باوجود جو لوگ اس کی خلاف ورزی میں مبتلا تھے اور جن کی زندگیوں پر غیر اسلامی نظریات کی حکومت تھی، جماعت اسلامی نے ان کے تضادِ فکر و عمل کو نمایاں کیا اور بتایا کہ اسلام محض عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے نہیں، بلکہ عمل کے لیے ہے۔ محض تعریف و تحسین کے ذریعہ اسلام کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ یہ حق اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب کہ اس کی مکمل اتباع کی راہ اختیار کی جائے۔

(۳) جن حلقوں میں اسلام محض عبادات یا صرف بعض اخلاقیات تک محدود تھا

یا جو اسے شعوری طور پر سماجی اور سیاسی زندگی سے دور ہی رکھنا چاہ رہے تھے، جماعت نے ان کے سامنے اس حقیقت کو ابھارا کہ اسلام پوری زندگی میں اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان اس کے سامنے سر بھی جھکائے اور اطاعت بھی کرے، اسی کا حکم گھر اور بازار میں چلے، عدالت کی کرسی سے اسی کے قانون کا نفاذ ہو اور ایوانِ سیاست میں اسی کی بالادستی قائم رہے۔ یہ عقیدہ وعمل کا ایک مربوط نظام ہے۔ اس کا ایک جزء دوسرے جزء سے جڑا ہوا ہے۔ یہ ایک وحدت ہے جس کے حصے بخرے نہیں کیے جاسکتے۔ اس کے بعض احکام کو اختیار کرنا اور بعض دوسرے احکام کو چھوڑ دینا صحیح نہیں ہے۔

(۴) اس وقت کی سیاسی تحریکیں قومیت کے نشے میں سرشار تھیں، قومی نقطۂ نظر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ اس کے خلاف کوئی بات سننا ان کے لیے گوارا نہ تھا۔ جماعت اسلامی ان تحریکوں سے الگ تھلگ رہی۔ اس نے لوگوں کو قوم پرستی کے نقصانات سے آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ قوم پرستی انسانوں کے اندر تعصب، نفرت اور عداوت کے بیج بوتی اور رواداری اور محبت کے جذبات کو نقصان پہنچاتی ہے۔ جب یہ حد سے آگے بڑھتی ہے تو دوسری قوموں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور ایک قوم کو دوسری قوم کا حریف بنادیتی ہے۔ اسی سے فاشزم نے جنم لیا اور جنگ عظیم کی شکل میں دنیا کو اس تباہی کا سامنا کرنا پڑا جس سے وہ آج بھی پناہ مانگتی ہے۔

جماعت اسلامی نے مسلم قوم پرستی کی بھی مخالفت کی۔ اس نے یاد دلایا کہ مسلمان ایک قوم نہیں، بلکہ ایک ملت ہیں۔ اس ملت کو جغرافیائی حالات نے

جنم نہیں دیا ہے، بلکہ یہ بعض اصول و نظریات کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ جو ان نظریات کو مانے وہ مسلمان ہے اور جو ان کو نہ مانے وہ اس سے خارج ہے۔ یہ امت جس دین کی حامل ہے وہ کسی خاص گروہ کا دین نہیں ہے، وہ تمام انسانوں کے لیے ہے۔ لیکن اگر یہ امت ایک قوم بن جائے اور ایک قوم کی حیثیت سے سوچنے لگے تو اس کا دین بھی ایک قومی دین یا مذہب بن کر رہ جائے گا، دوسری قوموں اور ملتوں کے لیے اس میں کوئی کشش باقی نہ رہے گی۔

سیاسی میدان میں جماعت اسلامی نے حاکمیت اللہ کے تصور کو نمایاں کیا۔ انسان اپنی زندگی کے لیے ایک ضابطہ اور قانون چاہتا ہے۔ کسی قانون کے بغیر وہ زندگی نہیں گزار سکتا۔ سوال یہ ہے کہ یہ ضابطہ اور قانون کون دے اور کس کا قانون چلے؟ اس کے تین جواب ممکن ہیں:

ایک یہ کہ ہر فرد اپنے لیے قانون اور ضابطہ بنانے میں آزاد ہو اور اس پر کسی دوسرے کی حکم رانی نہ چلے۔ یہ ناممکن ہے۔ اس سے معاشرہ سخت انتشار، بدنظمی اور انارکی کا شکار ہو جائے گا۔ اس لیے کہ معاشرہ ہر شخص کی آزاد مرضی کے مطابق چل نہیں سکتا۔ وہ ایسا قانون چاہتا ہے جس کے سب پابند ہوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی ایک فرد یا کچھ افراد مل کر قانون بنائیں۔ اسی کے نتیجہ میں بادشاہت، آمریت اور جمہوریت وجود میں آئی۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے، دنیا نے اسے بہترین نظامِ قانون و سیاست کی حیثیت سے عملاً قبول کرلیا ہے۔ جن ممالک میں جمہوریت نہیں ہے وہ بھی اس کی مخالفت کی ہمت نہیں کر پاتے۔ جماعت اسلامی بادشاہت اور آمریت کے مقابلہ میں اسے بہتر ضرور سمجھتی ہے، لیکن یہ حقیقت بہ ہر حال اپنی جگہ قائم ہے کہ یہ سب انسان پر انسان کی حکومت کی مختلف شکلیں ہیں۔ بادشاہت اور آمریت ایک فرد کی حکم رانی کا نام

ہے اور جمہوریت میں عملاً کچھ افراد کی حکومت ہوتی ہے۔ یہ بات بالکل غیرفطری اور نامعقول ہے کہ کسی فرد یا کچھ افراد کو قانون سازی کا بلند ترین مقام حاصل ہو اور باقی لوگ اس کی اتباع پر مجبور ہوں۔[۱]

سب سے بڑی بات یہ کہ انسان کے ذرائعِ علم بہت محدود ہیں اور اس کے ساتھ جذبات وخواہشات اور ذاتی و گروہی تعصبات لگے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے وہ ایسا قانون نہیں بنا سکتا جس میں ہر ایک کی رعایت ہو، جو سب کی ضروریات کی تکمیل کرے اور جس سے عدل و انصاف کے تقاضے بے لاگ طریقہ سے پورے ہوں۔ انسان نے اپنی عقل، تجربہ اور روایات کے تحت جو بھی قوانین بنائے وہ سب ناکام ہو چکے ہیں، ان پر اصرار کرنا بہت بڑی نادانی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک بلند تر ہستی کا قانون، جو تمام خامیوں سے پاک ہو، انسان پر حکم رانی کرے۔ یہ بلند تر ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے جو اس کا خالق و مالک ہے۔ جماعت اسلامی نے مختلف پہلوؤں سے یہ حقیقت واضح کی اور یاد دلایا کہ وہی ہمارا حاکم تکوینی بھی ہے اور حاکم تشریعی بھی۔ علی الاطلاق قانون سازی اسی کا حق ہے اور اسی کا قانون صحیح اور واجب الاتباع ہے۔ کسی فرد، ادارہ یا گروہ کو اس سے آزاد ہو کر قانون سازی کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو اس حق کا دعویٰ کرتا ہے وہ اپنی فطری حد سے تجاوز کرتا ہے اور ایک ایسی حیثیت کا دعویٰ کرتا ہے جو فی الواقع اسے حاصل نہیں ہے۔

سب سے اہم بات یہ کہ جماعت اسلامی نے حاکمیت الٰہ کے تصور کی یاد دہانی کے ساتھ ساتھ غلبۂ دین کے تصور کو بھی ابھارا۔ اس نے بتایا کہ اسلام غالب ہونے کے لیے آیا ہے، کسی دوسرے نظام کے تابع یا اس کا آلۂ کار بن کر

---

(۱) اس موضوع پر مزید کچھ بحث 'پالیسی اور طریقۂ کار' کے تحت آگے آ رہی ہے۔

رہنا اسے ہرگز گوارا نہیں ہے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ تو دوسرے تمام نظاموں کو اپنے تابع دیکھنا چاہتا ہے۔ اس حقیقت کو جماعت نے حاکمیت الٰہ کے ایک لازمی تقاضے کی حیثیت سے پیش کیا۔ جب اللہ تعالیٰ ہمارا حقیقی حاکم ہے تو یہ نہایت معقول اور فطری بات ہے کہ پوری زندگی پر اسی کی حکم رانی ہو۔ عبادت اسی کی ہو، اخلاقیات اسی کے تابع ہوں، قانون اسی کا چلے، معیشت اسی کے احکام کی پابند ہو۔ سیاست میں اسی سے رہ نمائی حاصل کی جائے۔ غرض ہر شعبۂ حیات میں اسی کے احکام و ہدایات کی اتباع کی جائے۔ جب تک انسان پر انسان کی حکومت ہے اور پوری دنیا کو نئے نئے فلسفوں کے تحت غلامی کا درس دیا جارہا ہے، اللہ کے دین کو حکم رانی کا یہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قیادت و سیادت کا منصب اللہ ہی کے دین کو حاصل ہو اور ہر میدان میں وہ فیصلہ کن رول ادا کرے۔ اس دشوار گزار مہم کو سر کرنے کے لیے بڑی طویل جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد قانون کے دائرے میں، پرامن اور اخلاقی حدود کی پابند ہوگی۔ لیکن یہ بہرحال، بادِ مخالف کی طرف پیش قدمی ہے۔ یہ ایک نئی دنیا کی تعمیر ہے۔ اس لیے اس راہ میں شدائد اور مشکلات بھی ہیں انھیں لازماً برداشت کرنا ہوگا۔

بعض دینی حلقے جماعت کی اس جدوجہد کو ناپسند کررہے تھے۔ اس کی انھوں نے مخالفت بھی کی۔ جماعتِ اسلامی نے ان کے شکوک وشبہات دور کیے، بے جا اعتراضات کی تردید کی اور ثابت کیا کہ اللہ کا دین جب غالب ہونے کے لیے آیا ہے تو یہ جدوجہد ضروری ہے۔ اسلام کی محکومی اور زیردستی پر مطمئن ہوجانا اور اس کو سربلند کرنے کی کوشش سے کنارہ کش رہنا درست نہیں ہے۔ یہ ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ ایمان کا بالکل کھلا تقاضا یہ ہے کہ آدمی دین کی محکومی پر تڑپ اٹھے اور اپنا سر دے کر بھی اسے غالب کرسکتا ہو تو دریغ نہ کرے۔ اس کے

ساتھ اس نے دین کے مغلوب اور محکوم ہونے کے نقصانات واضح کیے اور بتایا کہ اس سے دین و شریعت کے بہت سے شعبے عملاً معطل ہوکر رہ جاتے ہیں اور دین کے اسی حصہ پر عمل ممکن ہوتا ہے جس پر عمل کی نظامِ غالب اجازت دے۔ یہ اجازت اسی حد تک ہوتی ہے جس حد تک اس کے مفاد کو ٹھیس نہ پہنچے۔ حالات کے لحاظ سے یہ اجازت محدود سے محدود تر بھی ہوسکتی ہے اور ایک وقت وہ بھی آسکتا ہے جب کہ اسلام کا نام لینا بھی دشوار ہوجائے۔ پھر یہ کہ ایک محدود دائرہ میں اسلام پر عمل ہوتو اس کے وہ ثمرات بھی ظاہر نہیں ہوسکتے جو اس وقت ظاہر ہوسکتے ہیں جب کہ ہر طرف اس کی حکم رانی ہو۔ (دسمبر ۱۹۸۷ء)
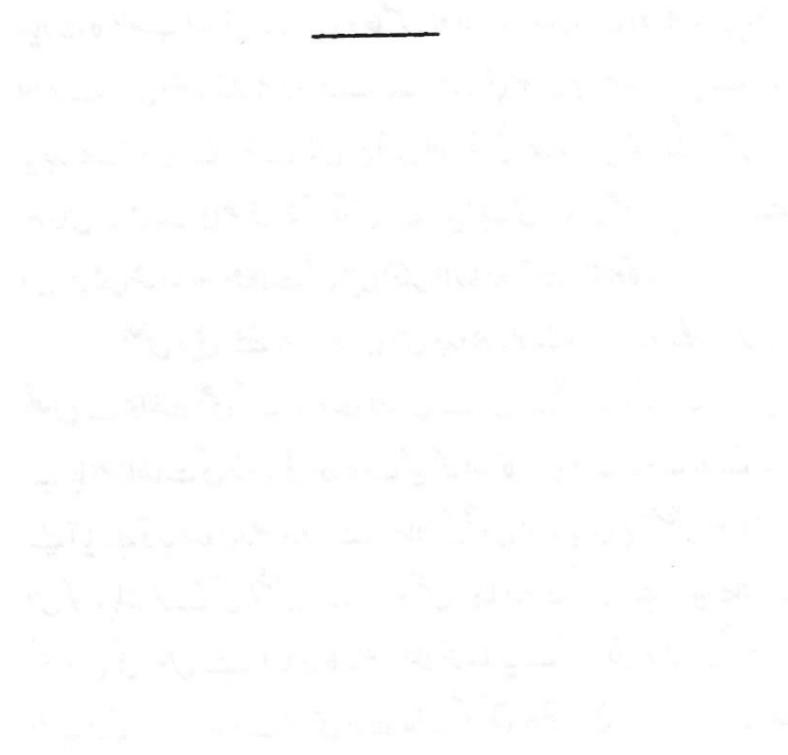
علمی خدمات

جماعت کے علمی سرمایہ کے امتیازی پہلو

جماعت اسلامی کا ایک بڑا کارنامہ وہ علمی اور فکری سرمایہ ہے جو اس نے فراہم کیا ہے۔ یہ سرمایہ کئی پہلوؤں سے بڑی قدر و قیمت اور اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے موضوعات نئے ہیں، اس میں تنوع ہے، تجزیہ و تحلیل ہے، سائنٹفک انداز ہے، وہ آج کے زندہ مسائل سے بحث کرتا اور ان کی پیچیدگیوں کو حل کرتا ہے، وہ اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کو دور کرتا اور موجودہ افکار و نظریات کے مقابلے میں اس کی فکری برتری کو دلائل کی پوری قوت کے ساتھ ثابت کرتا ہے، اس نے دفاعی موقف کی جگہ اقدامی انداز اختیار کیا اور اس جرأت و ہمت کے ساتھ اسلام کی ترجمانی کا فرض انجام دیا کہ معاصر لٹریچر میں اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

جماعت اسلامی کے علمی کام کا آغاز تقسیم ہند سے پہلے مولانا سیّدابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کیا۔ تقسیم کے بعد بھی مولانا مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک اسے جاری رکھا۔ جماعت نے جو متنوع کام انجام دیا ہے اس میں دوسرے اصحابِ علم بھی شریک رہے۔ اگر پورے اس کام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ حصہ بھی کم اہم نہیں ہے۔ اس میں بعض ان اصحاب کا بھی تعاون حاصل رہا جن کا

جماعت سے ضابطہ کا تعلق نہیں تھا، لیکن جماعت نے اسے اپنا ہی کام سمجھا۔

جماعت اسلامی نے جس نوعیت کا علمی کام انجام دیا ہے اس کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ جماعت کے وجود میں آنے سے پہلے یا اس کے بعد وہ اس ملک میں نہیں ہو رہا تھا، لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جماعت کے سوا کسی نے بھی اتنا جامع منصوبہ لے کر آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ گوشے جن کو جماعت نے نمایاں کیا

جماعت کے علمی کام میں کیا کمی ہے، اسلام کو درپیش مسائل پر مزید کن پہلوؤں سے کام کی ضرورت ہے اور کون سے گوشے تحقیق طلب ہیں؟ یہاں ان سب سوالات سے بحث نہیں ہے۔ اس پر الگ سے گفتگو ہوسکتی ہے۔ جماعت نے اپنی بساط بھر جو خدمت انجام دی ہے اس وقت صرف اس کا تھوڑا سا تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

۱- اسلام کا صحیح تعارف

جماعت نے پہلے روز سے محسوس کیا کہ اسلام کا صحیح تعارف ضروری ہے۔ اس تعارف کے نہ ہونے کی وجہ سے اسلام کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ضرورت مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں ہی کے لیے ہے۔ چناں چہ جماعت نے ان کی مختلف علمی اور فکری سطح کو سامنے رکھ کر اسلام کے تعارف کی کوشش کی اور اب بھی کررہی ہے۔ جو شخص اسلام کو صحیح شکل میں سمجھنا چاہے، اسے جماعت کے اس موضوع پر تیار کردہ لٹریچر سے بڑی مدد مل سکتی ہے، اس کی ذہنی گرہیں کھل سکتی ہیں اور اس کے سوالات کا معقول اور مدلل جواب مل سکتا ہے۔

۲- الحاد و دہریت کی تردید

الحاد و دہریت نے موجودہ دور کو اپنے شکنجے میں کس رکھا ہے۔ اس کے تمام علوم وفنون انسان کو انکارِ خدا کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وحی و رسالت، حشر ونشر اور جنت و دوزخ جیسی غیبی حقیقتوں کی تضحیک کی جاتی ہے اور انھیں خلافِ عقل سمجھ کر ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ جماعت نے اپنے مضبوط لٹریچر کے ذریعہ ثابت کیا کہ خدا کا انکار ایک غیر دانش مندانہ رویہ ہے۔ اسے تسلیم کیے بغیر اس کائنات کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ اس نے بتایا کہ انسان اپنی عقل و تجربہ سے اپنے مسائل حل نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے وحی و رسالت کو ماننا ضروری ہے، اسی سے اس کے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔انسان اس دنیا میں ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔ آخرت کا انکار کرکے وہ اپنی اس حیثیت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پھر اسے حیوان کی سطح تک پہنچنے اور بے راہ روی اختیار کرنے سے کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی۔

۳- بے قید جمہوریت پر تنقید

موجودہ دور نے اپنے اجتماعی معاملات کے حل کے لیے بالعموم جمہوریت کی راہ اختیار کی۔ جماعت اسلامی نے بے قید جمہوریت کی کمزوریاں واضح کیں اور خدا کے قانون کے تحت انسان کے اختیار اور انتخاب کا تصور پیش کیا۔ یہ واضح کیا کہ جمہوریت کو خدائی کا مقام نہیں دیا جاسکتا۔

۴- اسلامی نظامِ معیشت کا تعارف

معیشت کے میدان میں سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید کی اور اسلام کے نظامِ معیشت کو پوری تفصیل سے پیش کیا اور ثابت کیا کہ اسلامی نظام معیشت ان خرابیوں سے پاک ہے جو ان نظاموں میں پائی جاتی ہیں۔

۵- زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ

یہ غلط تصور مغرب کے زیر اثر پورے عالم پر چھایا ہوا تھا کہ مذہب انسان کا شخصی معاملہ ہے۔ اجتماعی معاملات پر غور کرتے وقت اسے زیر بحث نہیں آنا چاہیے۔ آج بھی یہ تصور زندہ ہے اور اجتماعی زندگی سے مذہب عملاً بے دخل ہے۔ مسلمانوں میں اس کے برملا اظہار کی ہمت تو شاید کم ہی لوگ کر پاتے ہیں، لیکن ایسے افراد کی کمی نہیں رہی ہے جو عملاً اجتماعی زندگی کو مذہب سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی کو اس طرح تقسیم کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا ایک چھوٹا سا حصہ تو اللہ تعالیٰ کے دین کے تابع ہو اور بڑا حصہ ان کے ہاتھ میں رہے، تاکہ اسے وہ جس کے حوالہ کرنا چاہیں کرسکیں، چاہے وہ ان کا اپنا نفس اور اپنی خواہشات ہوں یا دوسرے کا نفس اور اس کی خواہشات۔ جماعت اسلامی نے یہ حقیقت واضح کی کہ اللہ کا دین ایک کل ہے، اسے تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ وہ Part Time Service کا قائل نہیں، بلکہ پوری زندگی پر اپنا اقتدار اور حکومت چاہتا ہے اور مکمل اطاعت اور انقیاد کا مطالبہ کرتا ہے۔ خود انسان کی فطرت اس تضاد کو آسانی سے قبول نہیں کرسکتی کہ وہ ایک خاص دائرے میں اللہ کا بندہ بنا رہے اور دوسرے دائرہ میں بلکہ یوں کہیے کہ دائروں میں اس کی نافرمانی اور بعض اوقات بغاوت کا رویہ اختیار کرلے۔ دنیا اس تضاد کو چاہے برداشت کرلے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ بہ خوشی برداشت کر رہی ہے، اللہ تعالیٰ کا دین اسے کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔

۶- اسلام ایک نظامِ حیات ہے

اسلام اس وسیع کائنات کے بارے میں بعض مابعد الطبیعیاتی عقائد ہی فراہم نہیں کرتا، بلکہ ان کی بنیاد پر زندگی کا ایک مفصل اور مربوط نقشہ بھی پیش کرتا

ہے۔ وہ ایک نظامِ حیات ہے جو انسان کی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام پہلوؤں سے ایک خاص نقطۂ نظر سے بحث کرتا ہے۔ یہ دعویٰ حرف بہ حرف صحیح اور واقعہ کے مطابق ہونے کے باوجود بہت بڑا تھا اور موجودہ بے دینی کے ماحول میں اس کا ثابت کرنا کچھ آسان نہ تھا، لیکن جماعت نے اس حقیقت کو صرف یہی نہیں کہ پورے زور اور قوت کے ساتھ پیش کیا، بلکہ علمی اور فکری محاذ پر اس میدان میں بڑی کام یابی حاصل کی۔ اس نے عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون، حدود و تعزیرات اور فرد و معاشرہ کے روابط پر جو علمی خدمت انجام دی ہے اور جس طرح اسے آج کے ذہن و فکر کو سامنے رکھ کر مدلل کرنے کی کوشش کی ہے وہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے اسلامیات کا کوئی بھی طالب علم آسانی سے نظرانداز نہیں کرسکتا۔

۷- امت مسلمہ کا مقصدِ وجود

امت مسلمہ ایک خاص مقصد کے لیے وجود میں آئی ہے۔ اسے اللہ کے رسولوں کی نیابت میں شہادت علی الناس کا فرض انجام دینا ہے۔ ان پاک نفوس نے ہر خوف و خطر سے بے نیاز ہوکر اللہ کے بندوں کو طاغوت کی بندگی ترک کرکے اللہ واحد کی بندگی اختیار کرنے کی دعوت دی اور اس کے لیے پوری قوت صرف کردی، باطل کو ہر طرف سے للکارا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے باطل کہا، اس راہ میں جو شدائد و مشکلات پیش آئے انھیں ہنسی خوشی برداشت کیا، لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائی۔ جماعت اسلامی نے کہا: امت کو یہی کام اسی نہج پر انجام دینا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور اس سے شاید مشکل ہی سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ امت کے اندر اپنے اس مقصدِ وجود کا احساس کم زور پڑ رہا تھا۔ جماعت نے اپنے مؤثر اور مضبوط لٹریچر کے ذریعہ اس احساس کو بیدار کرنے کی

کوشش کی اور اس کے لیے تگ و دو پر اسے آمادہ کیا۔ اس کی اس کوشش کے اثرات آج معاشرہ میں نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

۸- دین میں اجتماعیت کی اہمیت

دین میں اجتماعیت کی بڑی اہمیت ہے۔ مسلمان سب کے سب ایک امت ہیں اور امت ایک بامقصد جماعت کو کہا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث نے امت کے جسد واحد ہونے کا تصور پیش کیا ہے۔ خلافت اسی اجتماعیت کی ارفع و اعلیٰ شکل تھی۔ خلافت کے خاتمہ کے بعد یہ نظمِ اجتماعی بکھر گیا اور آہستہ آہستہ امت گروہوں اور فرقوں میں بٹ گئی۔ جماعت نے اس افتراق و انتشار کے نقصانات بتائے، اجتماعیت کی اہمیت واضح کی اور یہ احساس بیدار کرنے کی کوشش کی کہ امت کو مختلف اغراض و مقاصد کے پیچھے دوڑنے اور آپس میں لڑنے کی جگہ ایک ٹیم کی طرح ایک مقصد اور ایک منزل کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔ یہی شریعت کا منشا ہے اور اسی میں اس کی کامیابی ہے۔

۹- فقہی توسّع

شریعت میں فقہی اختلافات کی گنجائش ہے، ان کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اختلافات اپنے حدود میں ناپسندیدہ نہیں ہیں۔ ان سے احکام شریعت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور ان سب سے استفادہ آسان ہوتا ہے۔ شریعت پر غور وفکر ہی کے نتیجہ میں، مختلف مکاتبِ فقہ وجود میں آئے اور اسلامی قانون کی زبردست خدمت انجام پائی، لیکن آہستہ آہستہ ان کے ماننے والوں کے درمیان ذہنی طور پر دوری پیدا ہونے لگی اور وہ ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ بعض استثنائی مثالوں سے قطع نظر ایک مکتب فکر کا حامل، دوسرے مکتب فکر کی کسی رائے پر نہ تو سنجیدگی

سے غور کرنے کے لیے تیار تھا اور نہ اپنے مسلک کے چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ کو چھوڑنا چاہتا تھا۔ ساری ذہنی وفکری قوت اپنے مسلک کی تائید اور دوسرے مسلک کی تردید میں صرف ہورہی تھی۔ (اس صورت حال میں اب بھی کچھ زیادہ تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے) جماعت اسلامی نے واضح کیا کہ فقہی اختلافات کو اپنے حدود میں رہنا چاہیے۔ ان کی بنیاد پر گروہ بندیوں کا وجود میں آنا اور اختلاف کا اس حد تک بڑھ جانا کہ ہم ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں، صحیح نہیں ہے۔ اس سے امت کا شیرازہ بکھرتا ہے اور دین کے اہم تقاضے مجروح ہوتے ہیں۔ بغیر کسی تعصب کے ان فقہی اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم سب کو دین کی خدمت اور اس کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ جماعت اسلامی کم از کم اپنے دائرہ میں مختلف مکاتبِ فقہ کے ماننے والوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور تعصّبات کو کم کرنے میں بڑی حد تک کام یاب رہی ہے۔ چناں چہ جماعت کے اندر جو لوگ بھی آئے دین کی سربلندی کی اس کوششوں میں جی جان سے لگ گئے اور فقہی مسالک کا اختلاف ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوا۔ اس میں حنفی، شافعی، اہلِ حدیث سب ہی مسالک کے ماننے والے موجود ہیں اور سب ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ اس طرح کی باقاعدہ کوشش جماعت سے پہلے قریب کے زمانہ میں کوئی نہیں ہوئی تھی۔

۱۰- اللہ کے دین کو غالب کرنے کی کوشش کی جائے

اللہ کا دین غالب اور سربلند ہونے کے لیے آیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے حکومت وفرماں روائی کا مقام ہو، ہر طرف اس کا قانون چلے اور معاشرہ اس کے احکام کا تابع ہو۔ لیکن ہم نے صدیوں سے دیکھا اور آج بھی دیکھ رہے ہیں

کہ اللہ کے دین کو یہ مقام حاصل نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس دین کے ماننے والوں میں وہ بے چینی اور اضطراب نہیں ہے جو اس کی زبوں حالی پر ان میں ہونا چاہیے۔ یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں ہے جن کا دین کا مطالعہ محدود ہے، جن کے دل و دماغ نے اسے پوری طرح جذب نہیں کیا ہے اور جو اس کے علم بردار نہیں سمجھے جاتے، بلکہ معاف کیا جائے ان بزرگوں میں بھی جو علم و فضل کے پہاڑ تصور کیے جاتے ہیں اور جن کی نیکی اور تقویٰ کو کوئی چیلنج نہیں کرسکتا، اس کی کوئی فکر نہیں محسوس ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات کسی نہ کسی گوشہ سے دین کی اس صورت حال پر رنج وغم کا اظہار بھی ہوتا ہے، لیکن اس کی نوعیت انفرادی احساسات سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دین کو مظلوم دیکھ کر لوگوں نے بسااوقات بڑی قربانیاں بھی دی ہیں اور اس کے اچھے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں، لیکن دین کی سربلندی صحیح معنی میں اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کے لیے اجتماعی جدوجہد کی جائے۔ جماعت اسلامی کی علمی کوششوں کا ایک حصہ یہ بھی رہا ہے کہ دین کی سربلندی کا تصور پیدا کیا جائے اور امت کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اس کے لیے اجتماعی جدوجہد کرے۔ اس حقیقت سے جس طرح آج کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ دین کی سربلندی کا جذبہ امت میں کسی حد تک ضرور پیدا ہوا ہے، اسی طرح اس بات سے انکار بھی اس کے لیے دشوار ہوگا کہ اس جذبہ کے بیدار کرنے میں سب سے زیادہ جماعت کی کوششوں کا دخل ہے۔

جماعت اسلامی نے اپنے لٹریچر میں جن گوشوں کو واضح کیا اس کے سلسلے میں عام شعور بیدار کرنے کی بھی کوشش کی۔ آج اس کی صدائے بازگشت پورے برصغیر کے علمی حلقوں میں سنی جاسکتی ہے۔ (اکتوبر ۱۹۸۶ء)

دعوتی، اصلاحی اور رفاہی خدمات

جماعتِ اسلامی کی دعوت

اسلام اس مطالبہ کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ دنیا کا ہر فردِ بشر اللہ تعالیٰ کو صدق دل سے اپنا خالق و مالک اور معبود تسلیم کرے، اس کا بندہ، اس کا عبادت گزار اور فرماں بردار بن کر رہے، زندگی کے کسی بھی شعبہ اور کسی بھی گوشہ میں بغاوت اور نافرمانی کی روش نہ اختیار کرے، اسی بنیاد پر معاشرہ کی تعمیر ہو، معیشت اور معاشرت کی تشکیل کی جائے، تہذیب وتمدن فروغ پائے، قومی اور بین الاقوامی معاملات طے ہوں، حکومت و ریاست کا نظم چلے، غرض پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے اور اس کے دین کے مطابق بسر ہو۔ اسی سے وہ دنیا میں پاک وصاف اور سکون کی زندگی گزار سکے گا اور آخرت کی ابدی کام یابی سے ہم کنار ہوگا۔

جماعت اسلامی ہند اسلام کی اسی دعوت اور اس کے اسی پیغام کو ہندستان میں عام کرنا چاہتی ہے۔ وہ اس کی بنیاد پر فرد اور سماج کے اندر ایک صالح اور پاکیزہ انقلاب کی داعی ہے۔

ملک میں رائج بعض نظریات

ہندستان کی سیاسی اور مذہبی صورت حال خاصی پیچیدہ ہے۔ یہاں دو

طرح کے نظریات کام کررہے ہیں: ایک نظریہ سیکولرزم کا ہے، جو مذہب کو فرد کا ذاتی معاملہ قرار دیتا ہے اور اجتماعی معاملات سے اسے الگ رکھنا چاہتا ہے۔ بلکہ ہندستان کے بہت سے ممتاز اور نام ور لیڈروں کا اصرار ہے کہ مذہب کو ہمارے اجتماعی امور و مسائل سے لازماً الگ رہنا چاہیے۔ وہ کسی اجتماعی مسئلہ میں مذہب کا نقطۂ نظر سننے کے بھی روادار نہیں ہیں، حالاں کہ آزادیِ فکر کے اس دور میں اور آزادیِ فکر کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ مذہب کے بارے میں اس تعصب اور تنگ نظری کی فی الواقع کوئی معقول بنیاد نہیں ہے۔ اگر کوئی مذہب اجتماعی معاملات میں اپنا متعین نقطۂ نظر رکھتا ہے تو اسے ملک کے سامنے آنا چاہیے اور اس پر سنجیدگی سے غور وفکر اور بحث و مباحثہ کا موقع ملنا چاہیے، تاکہ اس کی صداقت کو پرکھا جاسکے اور حق بات واضح ہوسکے۔

اس ملک میں دوسرا نقطۂ نظر قدیم سنسکرتی کے احیاء کا رہا ہے۔ یہ اپنی قدیم تہذیب کی طرف واپسی کا ایک مبہم سا احساس ہے۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے ذریعہ ملک کے مسائل کس طرح حل ہوں گے اور اس کی تعمیر وترقی کیسے ہوگی؟ البتہ اس کے پیچھے کچھ ایسے منفی رجحانات کام کررہے ہیں جو عوام کے لیے کسی درجے میں کشش کا باعث ہیں۔ بعض وقتی اور ہنگامی مسائل سے ان کو تقویت ملتی رہتی ہے۔ مختلف وجوہ و اسباب کے تحت اس کی خامیوں اور خرابیوں اور ملک کے لیے اس کے نقصانات کو واضح کرنا اس وقت تحریک کی ایک اہم ضرورت ہے۔

سیکولرزم اور قدیم سنسکرتی کے احیاء کے یہ دونوں رجحانات ملک کے اندر یوں تو بہت پہلے سے موجود تھے، مگر اب ان کے درمیان باقاعدہ صف بندی شروع ہوگئی ہے، لیکن ہمارا ملک جس مہیب خلا سے دوچار ہے اسے پر کرنے اور یہاں کے بگاڑ کو دور کرنے میں یہ دونوں ہی ناکام ہیں۔ ان حالات میں جماعت

اسلامی ہند نے اپنی محدود قوت و صلاحیت کے پیش نظر بعض اہم کاموں کو ترجیحی حیثیت سے اختیار کیا اور انھیں دوسرے کاموں پر مقدم رکھا ہے۔

غیر مسلموں میں جماعت کا طریقۂ کار

ہندستان ایک وسیع ملک ہے، جس کی آبادی اس وقت نوے کروڑ☆ کے قریب پہنچ رہی ہے۔ وہ اپنے دامن میں دنیا کی آبادی کے پانچویں حصہ کو لیے ہوئے ہے۔ ایک طرف اس عظیم ملک کی اکثریت ہے، جو اسلام کی تعلیمات سے بڑی حد تک بے خبر ہے، بلکہ اس کے بارے میں اسے طرح طرح کی غلط فہمیاں اور شکوک و شبہات ہیں۔ دوسری طرف یہاں مسلمان بہت بڑی اقلیت کی حیثیت سے موجود ہیں، جن کی تعداد تیرہ چودہ کروڑ ہے۔☆☆ اکثریت کا ایک طبقہ انھیں ایک ایسی قوم کی حیثیت سے دیکھتا ہے جس نے صدیوں ان پر حکومت کی اور ان کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کا رویہ اختیار کیا، اس وجہ سے اس طبقہ میں مسلمانوں سے تعصب اور نفرت پائی جاتی ہے۔ خود مسلمانوں کا ذہن غیر مسلموں کے بارے میں صاف نہیں ہے۔ انھیں بہت سی شکایات ہیں۔ بعض اوقات ان کے درمیان حقوق و مفادات کی بحث اور کش مکش شروع ہوجاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے حریف اور مدِ مقابل بن جاتے ہیں۔ اس کش مکش کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسلام کا اس پہلو سے تعارف ہوتا رہا کہ وہ ایک ایسی قوم کا مذہب ہے جس کی اکثریت سے حریفانہ کش مکش ہے، لیکن اس پہلو سے تعارف نہیں ہوسکا کہ وہ اللہ واحد اور خالقِ کائنات کا دین ہے، اس میں ان کی اور تمام انسانوں کی فلاح و نجات کا سامان موجود ہے۔ یہ کسی خاص قوم یا نسل یا گروہ کا دین نہیں ہے، بلکہ ہر اس فرد کا دین ہے جو اسے قبول کرلے۔

☆ ملک کی آبادی ۲۰۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ایک ارب اکیس کروڑ ہوگئی ہے۔

☆☆ ۲۰۱۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندستان میں مسلمانوں کا تناسب تیرہ فی صد (13%) ہے۔

ان حالات میں جماعت اسلامی نے ضروری سمجھا کہ ملک میں ایسی فضا کو پروان چڑھایا جائے جس میں تعصب، نفرت اور عداوت کی جگہ رواداری، وسعتِ ظرف اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو برداشت کرنے کا جذبہ فروغ پائے، تاکہ لوگ حق کے پیغام کو سن سکیں اور اس پر غور وفکر کے لیے آمادہ ہوں۔ اس سلسلہ میں اس نے جو اقدامات کیے ہیں اس کے نمایاں پہلو یہ ہیں:

جماعت غیر مسلموں سے بے لوث قریبی ربط قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اپنے اجتماعات اور سمپوزیمس (Symposiums) وغیرہ میں انھیں شرکت کی دعوت دیتی ہے، ان کی باتیں سنتی اور ان کے سامنے اپنی بات پیش کرتی ہے۔ تجربہ یہ ہے کہ بلاشبہ مسلمانوں سے یہاں کے غیر مسلموں کو مختلف قسم کی شکایات ہیں، لیکن اس کے باوجود اسلام کو جاننے اور سمجھنے کی خواہش بھی ان میں موجود ہے۔ بعض اوقات وہ کھلے دل سے اس کی باتیں سنتے ہیں اور اس کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

جماعت کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے سماجی، اصلاحی، فلاحی اور رفاہی کاموں میں غیر مسلم بھی شریک ہوں۔ جو لوگ ان کاموں میں باقاعدہ تعاون کے لیے آمادگی ظاہر کرتے ہیں وہ جماعت کے معاون بن جاتے ہیں۔ اس طرح کے معاونین کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہے۔

جماعت اس بات کی پوری کوشش کر رہی ہے کہ ملک کے غیر مسلموں کو اسلام کے بارے میں صحیح معلومات فراہم ہوں اور اس کی حقانیت ان پر واضح ہو۔ زندگی کے مسائل اور مشکلات کو اسلام جس طرح حل کرتا ہے، فرد اور معاشرہ کی مادی خوش حالی اور اخلاقی رفعت کے جو اصول پیش کرتا ہے، سیاسی طور پر وہ جس طریقہ سے مختلف طبقات کو جوڑتا اور ایک وحدت بناتا ہے، ظلم و استحصال کو ختم کرتا اور معاشرہ میں مساوات اور برابری پیدا کرتا ہے، پھر یہ کہ جس طرح وہ روحانی

سکون فراہم کرتا، آخرت کی کامیابی کی راہ دکھاتا اور وہاں کی ابدی نعمتوں سے ہم کنار کرتا ہے، اسے ان کے سامنے دلائل و براہین کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس حقیقت سے بہرحال انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب تک ملک کا ایک قابل لحاظ طبقہ اسلام کے بارے میں صحیح رخ سے سوچنے سمجھنے کے لیے آمادہ نہ ہو، اپنی دنیوی اور اخروی فلاح کے لیے اس کی ضرورت نہ محسوس کرے اور اس کے حق ہونے کی شہادت نہ دے، اسلام کے حق میں فضا ہموار نہیں ہوسکتی اور اسلامی نقطۂ نظر سے کسی بڑی تبدیلی کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔

اس ملک میں اردو اور ہندی کے علاوہ بارہ بڑی بڑی علاقائی زبانیں ہیں۔ یہاں کی اکثریت یہی زبانیں بولتی ہے۔ ان زبانوں میں اسلامی لٹریچر یا تو مفقود تھا یا برائے نام تھا۔ جماعت نے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی اور ان تمام زبانوں میں قرآن، حدیث اور اہم اسلامی لٹریچر کے تراجم شائع کیے اور طبع زاد تصنیفات بھی پیش کیں۔ بعض زبانوں میں ان کی تعداد کئی سو تک پہنچتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور وقت کے ساتھ اسے جاری رکھنا ضروری ہے۔

ملک میں اسلام مخالف افکار و جذبات کے باوجود اسلام کی طرف رجحان بھی پایا جاتا ہے اور اس کی تعلیمات کو صاف ذہن کے لوگ قبول بھی کررہے ہیں۔ جماعت کی نگرانی میں ان کی دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کے لیے بعض ادارے بھی کام کررہے ہیں۔ ان کی اچھی خاصی تعداد ان اداروں سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔

مسلمانوں میں جماعت کے کام کے مختلف پہلو

۱- جماعت اسلامی ہند کی شروع ہی سے یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں میں جو فکری اور عملی خرابیاں موجود ہیں وہ دور ہوں۔ ان کے اندر دین کا

صحیح فہم و شعور پیدا ہو اور وہ شہادت علی الناس کا فریضہ انجام دینے کے قابل بن جائیں۔ اس کے لیے جماعت اپنے وسیع اور جان دار لٹریچر کی توسیع و اشاعت کے ساتھ درس و تدریس، اجتماعات، خطبات اور دعوت و تبلیغ کے دوسرے تمام جائز اور معروف ذرائع اختیار کرتی ہے۔

۲- ہندستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر اوّل روز ہی سے اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی کہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کا نظم کیا جائے، ورنہ آنے والی نسلوں کا دین پر قائم رہنا دشوار ہے۔ اس کے لیے جماعت نے ابتدائی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر نظم کیا، مدارس اور مکاتب کھولے اور اس معاملہ میں دوسری مسلم تنظیموں کے ساتھ تعاون بھی کیا۔ اس مقصد سے اس نے ایسا تعلیمی نصاب تیار کیا جو ایک طرف دین کا صحیح تعارف کراتا ہے اور دوسری طرف عصری معلومات بھی بہتر طریقہ سے فراہم کرتا ہے۔ یہ نصاب ملک کے سیکولر اداروں کے نصاب سے زیادہ دلچسپ اور پر کشش ہے اور اسے دوسرے حلقوں میں بھی مقبولیت حاصل ہے۔ اس وقت اس نصاب کے تحت جماعت کی نگرانی میں بارہ سو سے زیادہ مرکزی اسکول، ہمہ وقتی اور جز وقتی مدارس چل رہے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کی یہ کوششیں بعض مقامات پر ترقی کر کے کالج کی تعلیم تک بھی پہنچ چکی ہیں۔ کہیں کہیں تکنیکی ادارے بھی کام کر رہے ہیں۔ بیس بائیس ہوسٹل بھی ہیں۔

۳- مسلمان طلباء اور نوجوانوں کی طرف بھی جماعت کی خصوصی توجہ رہی ہے۔ اس وقت مختلف ناموں سے طلباء اور نوجوانوں کی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ ان کی ایک کل ہند تنظیم اسٹوڈینٹس اسلامک آرگنائزیشن (S.I.O) جماعت کی سرپرستی میں سرگرم عمل ہے۔ اس کی شاخیں ملک کی پچیس میں سے بیس ریاستوں میں اور سات مرکزی علاقوں میں سے دو میں موجود ہیں۔ اس تنظیم کے

ارکان ایک ہزار سات سو اور معاونین (Associates) اٹھائیس ہزار ہیں۔ غیر مسلم نوجوانوں میں اس کے ہم دردوں کی تعداد جو اس کے کاموں میں عملاً دلچسپی لیتی ہے، ایک ہزار سے زیادہ ہے۔

۴۔ مسلمان خواتین میں یوں تو تعلیم کا اوسط ہی بہت کم ہے اور جو خواتین جدید تعلیم حاصل کرتی ہیں، انھیں اسلامی تعلیمات سے دور کرنے اور ان کے اعتقاد کو متزلزل کرنے کی بڑی منظم جدوجہد بھی ہر جگہ ہو رہی ہے۔ جماعت اسلامی ہند کی یہ کوشش رہی ہے کہ ان کے اندر اسلامی فکر پیدا کیا جائے، اسلام پر ان کے ایمان و یقین کو مستحکم کیا جائے اور جدید تہذیب کے مقابلے میں اسلام نے ان پر جو احسانات کیے ہیں انھیں نمایاں کیا جائے۔ جماعت نے اس کے لیے ایک طرف تو طاقت ور لٹریچر فراہم کیا ہے اور دوسری طرف خواتین کو اس طرح تیار کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ خود موجودہ تہذیب کے غیر اسلامی اثرات کا مقابلہ کرسکیں۔ چناں چہ ملک کے بعض مقامات پر خواتین اور طالبات کے مشترک حلقے کام کررہے ہیں اور بعض علاقوں میں ان دونوں کے الگ الگ حلقے بحمداللہ متحرک اور فعال ہیں۔

ہندستان کے مسلمان متعدد مسائل سے دوچار ہیں۔ جماعت اسلامی ان کے ان تمام امور و مسائل کی طرف متوجہ ہے جن کا تعلق دین و ملت کے مفاد اور مسلمانوں کے تشخص اور ان کی بقا و تحفظ سے ہے۔ ان مسائل کے بارے میں جماعت کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر اور ان کی تمام تنظیمیں مل جل کر سوچیں اور اقدامات کریں، اس لیے کہ ان کے اشتراک و اتحاد کے بغیر ان کے حل کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ جماعت اسلامی اس اتحاد کے لیے مسلسل کوشاں ہے اور ہر اس کام میں عملاً تعاون کرتی ہے جو امت کی فلاح و بہبود کے

لیے مشترکہ طور پر انجام دیا جائے۔ اس سلسلہ میں اس نے مسلم مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لا بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل جیسے مشترکہ اداروں کے ساتھ ہمیشہ بھرپور تعاون کیا ہے اور کر رہی ہے۔

جماعت کی رفاہی خدمات

اسلام ایک دینِ رحمت ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے انسانوں کی خدمت اور دکھ درد میں کام آنے کا جذبہ ابھارا اور ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کی تلقین کی۔ جماعت اسلامی نے شروع ہی سے اسلام کی اس تعلیم کو پیش نظر رکھا اور اپنی قوت و استطاعت کے مطابق بندگانِ خدا کی خدمت کی کوشش کی۔

اس ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ بہت طویل ہے، لیکن آزادی کے بعد بعض ناگفتہ بہ اسباب کے تحت ان میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ان کی تعداد شائد سیکڑوں نہیں، ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ان فسادات میں بلاشبہ مسلمانوں کو زبردست جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض اوقات فسادات سے غیر مسلم بھائی بھی متاثر ہوئے ہیں۔ جماعت اسلامی کو دو ایک نہیں، متعدد فسادات میں ریلیف کے کام کی توفیق ملی۔ اس نے مسلم اور غیر مسلم کے فرق کے بغیر متاثرین کی مدد کی، جو بے گھر ہوگئے انھیں سر چھپانے کی جگہ فراہم کی، جن کے چھوٹے موٹے کاروبار ختم ہوگئے انھیں اپنا کاروبار شروع کرنے میں مدد کی۔ یتیموں اور بیواؤں کی ضروریات، جہاں تک اس کے امکان میں تھا، پوری کیں، جو بے قصور افراد مقدمات میں پھنسادیے گئے انھیں چھڑانے کی کوشش کی۔ جماعت اسلامی نے یہ کام کسی سیاسی مصلحت کے تحت نہیں، بلکہ دین کا تقاضا سمجھ کر انجام دیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے، اس کی ان خدمات کو

امت نے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس پر بھرپور اعتماد کیا ہے۔ بعض غیر مسلم حضرات نے بھی اس کی تحسین اور تعریف کی ہے۔

فسادات کے علاوہ جب بھی ملک کا کوئی حصہ سیلاب، طوفان یا زلزلے جیسی قدرتی آفات سے دوچار ہوا، جماعت نے متاثرین کی خدمت کو اپنا دینی و اخلاقی فرض سمجھا اور ان کی جو بھی خدمت کرسکتی تھی اس سے اس نے دریغ نہیں کیا۔

دوا علاج انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے، لیکن ہمارے ملک میں اس کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی آبادی کے لحاظ سے علاج کی ضروری سہولتیں نہیں ہیں۔ جماعت اسلامی کی اس طرف بھی توجہ رہی ہے۔ اس کی کوششوں سے جہاں بعض بڑے اسپتال قائم ہوئے وہیں کافی تعداد میں چھوٹے چھوٹے طبی مراکز بھی کام کررہے ہیں۔ اس نے بعض مقامات پر گشتی شفاخانوں کا بھی نظم کیا ہے، جن سے بغیر کسی تفریق کے ہر ضرورت مند فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ موجودہ سرکاری اسپتالوں میں عورتوں کو خاص طور پر زچگی کے موقع پر جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس سے سبھی لوگ واقف ہیں۔ جماعت کی نگرانی میں بعض اچھے معیار کے زچہ خانے قائم ہیں۔ ان سب سے بلامبالغہ روزانہ ہزارہا مریض فائدہ اٹھارہے ہیں۔

آج سود کے بغیر کوئی ضرورت مند کہیں سے قرض تک حاصل نہیں کرسکتا اور جب ایک مرتبہ سود پر قرض حاصل کرلیتا ہے تو اس کے جال میں مزید پھنستا چلا جاتا ہے۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور اس کی جگہ ضرورت مندوں کی اعانت کا جذبہ ابھارا ہے۔ اسی کی ایک صورت سود کے بغیر قرض دینا بھی ہے۔ جماعت کے تحت پورے ملک میں تین سو سے زیادہ بلاسودی قرض کی اسکیمیں چل رہی ہیں۔ ان اسکیموں میں ایک طرف تو اہلِ خیر حضرات مختصر مدت کے لیے اپنا پیسہ لگاتے ہیں اور اس پر کسی منافع کا مطالبہ نہیں کرتے، دوسری طرف اسی رقم سے قرض لینے والوں

کو بغیر سود کے قرض دیا جاتا ہے۔

جماعت گھریلو صنعتیں قائم کرنے میں بھی تعاون کرتی ہے، تاکہ غریب اور ضرورت مند طبقہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکے۔ اس طرح کے سو سے زیادہ مراکز پورے ملک میں کام کررہے ہیں۔

ان بڑے کاموں کے علاوہ جماعت اسلامی کی شاخیں، جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں، اہل خیر کے تعاون سے غریبوں، ناداروں، یتیموں اور بیواؤں کی حسبِ ضرورت اور حسبِ حال مدد کرتی رہتی ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کی کوششوں سے اس ملک سے غربت و افلاس ختم ہوجائے گا، یا اہل ملک کی معاشی مشکلات حل ہوجائیں گی، لیکن اس سے کم زور طبقات کے اندر یہ اطمینان ضرور پیدا ہوگا کہ خود غرضی اور مفاد پرستی کے اس ماحول میں ان کے ارد گرد ہمدردی کرنے والے افراد بھی موجود ہیں جو انھیں بے بسی اور کس مپرسی کی حالت سے نکالنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ اس سے توقع ہے کہ مسلمانوں کی اور ان کے ذریعہ اسلام کی صحیح تصویر اُبھر کر سامنے آسکے گی۔ (جولائی ۱۹۹۲ء)

تازہ اعداد و شمار

جماعت اسلامی ہند کی مجلس نمائندگان کے اجلاس منعقدہ ۲ تا ۵/اپریل ۲۰۱۷ء میں پیش کردہ جماعت کی رپورٹ کے مطابق چند اہم معلومات ذیل میں دی جارہی ہیں۔

جماعت اسلامی:

ارکان	10,056	کارکنان	58,900
مقامی جماعتیں	1170	مکاتب	584
مدارس	54	اقامتی مدارس	34
مراکز تعلیم بالغاں و بالغات	586	مراکز فاصلاتی تعلیم	600
جزوقتی مکاتب	775	پری پرائمری و پرائمری اسکول	213
جونیئر ہائی اسکول	115	ہائی اسکول	97
انٹر کالج/کالج	41	اسپتال	11
پروفیشنل کالج	2	ایمبولینس	26
ڈسپنسری/کلینک	346	بلا سودی سوسائٹیاں	83
مائیکرو فائنانس کے ادارے	364	سلائی سینٹر	149

SIO

ممبرس	6845	ایسوسی ایٹس	72,433
Sympathisers (ہمدرد)	2,95,289	یونٹس	1283
سرکلس	1047		

GIO

ممبرس	2,545	ایسوسی ایٹس	16,197
یونٹس	893	سرکلس	145

جماعت سے وابستہ ہم فکر اداروں کی تفصیلات یہاں نہیں پیش کی جا رہی ہیں۔

طریقۂ اصلاح و تربیت

بعض لوگ جماعت کے نظریات اور اس کے علمی کام کی تو تعریف کرتے ہیں، لیکن ان کا خیال ہے اور اس خیال کا وہ برملا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں کہ جماعت کے اندر تقویٰ اور روحانیت نہیں ہے۔ وہ دین پر عمل اور اس کی پابندی کے معاملہ میں بہت پیچھے ہے۔ یہ تنقید تقویٰ اور روحانیت کے ایک خاص تصور کے تحت کی جاتی ہے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ یہ تصور کہاں تک صحیح ہے اور اس کی کیا بنیاد ہے؟ جماعت اسلامی کو نیکی اور تقویٰ کا زعم نہ پہلے رہا ہے اور نہ اب ہے۔ اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ عمل کے لحاظ سے بلند ترین مقام پر فائز ہے اور دین کے تقاضے بدرجۂ اتم پورے کررہی ہے۔ اسے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہے اور وہ انھیں دور کرنے کی اپنے بس بھر کوشش بھی کرتی رہتی ہے۔ اس کے لیے اس نے قرآن وسنت کی روشنی میں اصلاح و تربیت کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس کی کسی قدر تفصیل سے پہلے ایک وضاحت ضروری ہے۔

اصلاح و تربیت کا مروّجہ طریقہ اور اس کی خامیاں

انسان کی دینی اور اخلاقی اصلاح کے لیے ان افراد اور حلقوں سے تعلق اور وابستگی کو ضروری سمجھا جاتا ہے جو تقویٰ اور دین داری میں خاص مقام رکھتے ہیں

اور اصلاح و تربیت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ صحبت کے اثر سے کون انکار کرسکتا ہے۔ نیکوں کی صحبت آدمی کو نیک بناتی ہے اور بروں کے ساتھ بیٹھ کر آدمی بُرے اثرات قبول کرتا ہے۔ لیکن جماعت اسلامی نے اصلاح و تربیت کے اس مروجہ نظام میں علمی اور عملی دونوں طرح کی خامیاں محسوس کیں، اس وجہ سے اس نے اسے اختیار نہیں کیا۔ اس نظام کی علمی خامی یہ ہے کہ امتدادِ زمانہ کے باعث اس میں بہت سی ایسی باتیں شامل ہوگئیں جن کا کتاب و سنت میں ثبوت نہیں ہے۔ ظاہر ہے، کسی بھی ایسے طریقہ کو، چاہے اس کی کتنی ہی افادیت کیوں نہ بیان کی جائے، جماعت اختیار نہیں کرسکتی جس کی تائید کتاب وسنت سے نہ ہو۔

اس نظام کی عملی خامی یہ ہے کہ اس سے انسان کی ہمہ جہت تربیت نہیں ہوتی، بلکہ محتاط بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ زندگی کے صرف چند گوشوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس سے انسان میں بعض خوبیاں نشو ونما پاتی ہیں تو بعض خوبیاں مرجھا بھی جاتی ہیں۔ اس میں حقوق اللہ پر تو زور دیا جاتا ہے، ذکر وفکر اور تسبیح وتہلیل کا اہتمام بھی ہوتا ہے، لیکن انسانوں کے مسائل و مشکلات سے بے رخی اور ان کے حقوق سے غفلت بھی برتی جاتی ہے۔ تواضع اور خاک ساری، مہر ومحبت، رواداری اور مروت کا اظہار تو ہوتا ہے، لیکن دینی غیرت وحمیت اور حق کی پامالی پر تڑپنے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ سنت کی اتباع میں ایک ایک جزئیہ کا خیال رکھا جاتا ہے، لیکن بڑے بڑے فرائض سے غفلت اور بے پروائی بھی دیکھی جاتی ہے۔ بعض اخلاقیات پر تو زور دیا جاتا ہے اور بعض کی اہمیت محسوس نہیں کی جاتی۔ معاملات میں کم زوری تو بالعموم باقی رہتی ہے۔ اس طرح اس نظامِ تربیت سے ایک غیر متوازن شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔

سب سے بڑی بات یہ کہ یہ نظامِ تربیت انسان کو باطل کے خلاف صف آرا نہیں کرتا۔ اس نظام کا پروردہ انسان خاص قسم کے جذبات و احساسات اور وارداتِ قلب

میں اس طرح گم رہتا ہے کہ اسے اپنے گردوپیش کی دنیا کی خبر نہیں ہوتی۔ جو شخص ان حالات ہی سے آنکھیں بند کرلے جو اس کے چاروں طرف رونما ہو رہے ہیں تو اس سے یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ ان کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری محسوس کرے گا اور جو خرابیاں موجود ہیں ان کی اصلاح کی کوشش کرے گا۔ یہاں کہا جاسکتا ہے کہ یہ تجزیہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ ان حلقوں سے بہت سے مصلحین اور مجددینِ وقت بھی اٹھتے رہے ہیں، جنھوں نے اصلاح و تربیت کی زبردست خدمات انجام دی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں جن مصلحین کا ذکر کیا جاسکتا ہے یا کیا جاتا ہے ان کی تجدیدی اور اصلاحی کوششوں کا انکار کرنا نادانی اور کم ظرفی ہے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان کے اندر روحِ تجدید ان حلقوں نے نہیں، بلکہ قرآن و حدیث سے براہِ راست تعلق نے پیدا کی، جس کے نتیجہ میں وہ ان حلقوں کی مخصوص روایات کو توڑ کر میدان عمل میں آئے اور تجدید و اصلاح کے غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔ اسے ان حلقوں کی طرف منسوب کرنے کی جگہ قرآن و حدیث کا کرشمہ قرار دینا زیادہ صحیح ہوگا۔

اصلاح و تربیت کے لیے جماعت اسلامی کی تدابیر

جماعت اسلامی نے اصلاح و تربیت کے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- کتاب و سنت سے رہ نمائی

جماعت سب سے پہلے قرآن و سنت کی طرف آدمی کو متوجہ کرتی ہے کہ وہ زندگی کے تمام معاملات کی طرح تربیت کے معاملہ میں بھی ان ہی سرچشموں سے راہ نمائی حاصل کرے۔ اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسول کو جو اعمالِ خیر اور جو

اعلیٰ اوصاف مطلوب ہیں ان ہی دو ذرائع سے ان کی تفصیل معلوم ہوسکتی ہے اور خوبیوں کے پیدا کرنے اور خامیوں کے دور کرنے کا صحیح جذبہ بھی ان ہی سے پیدا ہوسکتا ہے۔ جماعت اسلامی اپنے رفیقوں، ہم دردوں اور تعلق رکھنے والوں کو اس بات کی تاکید کرتی ہے کہ وہ کتاب وسنت سے براہِ راست اپنا رشتہ استوار کریں، ان کی روشنی میں اپنی سیرت وکردار اور جذبات کا برابر جائزہ لیتے رہیں، جو کم زوریاں اور خامیاں نظر آئیں ان کو دور کرنے کی اور جن خوبیوں سے زندگی تہی دامن ہے ان سے اپنا دامن بھرنے اور اپنی سیرت کو آراستہ کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔

قرآن وحدیث کے بعد اس لٹریچر سے بھی پورا فائدہ اٹھانے کا وہ مشورہ دیتی ہے جو اس مقصد سے ہم آہنگ اور اصلاح وتربیت میں معاون اور مددگار ہے، چاہے یہ لٹریچر جماعت سے وابستہ اہلِ علم کا تیار کردہ ہو یا جماعت سے باہر کے بزرگوں کا۔ اس معاملہ میں جماعت میں جو وسعتِ ظرف پائی جاتی ہے وہ دوسرے حلقوں میں کم ہی نظر آتی ہے۔

۲- احتسابِ نفس

جماعت تربیت کے لیے احتسابِ نفس کو ضروری سمجھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہمیشہ انسان کے پیشِ نظر رہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۸ (الحشر:۱۸)	اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

آیت کے شروع اور آخر میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم ہے اور درمیان میں اسی احتساب کی ہدایت ہے۔ یہ احتساب جتنا سخت ہوگا اللہ تعالیٰ کا خوف اور

تقویٰ بھی اتنا ہی پروان چڑھے گا۔ احتساب اس بات کا ہوتے رہنا چاہیے کہ آدمی نے آنے والے 'کل' کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ قیامت اور وہاں کا حساب کتاب دور نہیں ہے، بلکہ اس قدر قریب ہے جیسے آج کے بعد کل ہے۔

جماعت اپنے رفقاء اور متوسلین کو اسی احتسابِ نفس کی طرف مسلسل توجہ دلاتی رہتی ہے کہ ہر شخص خود اپنا جائزہ لیتا رہے اور یہ دیکھے کہ اس نے اپنا فرض کس حد تک ادا کیا اور کہاں اس سے کوتاہی ہوئی؟ کیا چیز حاصل کی اور کس چیز سے محروم رہا؟ عبادت، تقویٰ و طہارت، اخلاق و عادات اور سیرت و کردار کے لحاظ سے وہ کل کس مقام پر تھا اور آج کس مقام پر ہے؟ اپنی ذات کا اس طرح جائزہ ہی وہ بنیادی پتھر ہے جس پر انسان کی سیرت کی بلند و بالا عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اگر یہ بنیاد ہی کمزور ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی سیرت میں پختگی اور کردار میں مضبوطی پیدا نہیں کرسکتی۔ انسان اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو جس قدر جانتا یا جان سکتا ہے کوئی قریب ترین شخص بھی اس سے اتنا واقف نہیں ہوسکتا، اس لیے اپنا سب سے بڑا محاسب وہ خود ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے اندر خود احتسابی کا جذبہ ہو اور وہ بے لاگ طریقہ سے اپنا احتساب کرسکے۔

۳- اِقامتِ دین کی جدوجہد

جماعت اسلامی کے نزدیک تربیت کا ایک اہم ذریعہ اقامتِ دین کی جدوجہد ہے۔ اسی جدوجہد سے بہت سے وہ اعلیٰ اوصاف پیدا ہوسکتے ہیں جو اسلام کو مطلوب ہیں۔ یہ کوشش جس پیمانہ کی اور جس مقدار میں ہوگی ان اوصاف کو بھی اسی تناسب سے ابھرنے کا موقع ملے گا۔ ورنہ یہ وردِ زبان تو بنے رہیں گے، لیکن عملاً زندگی میں جلوہ گر نہیں ہوپائیں گے۔ اسے دو ایک مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔

صبر و استقامت ایک اعلیٰ خوبی ہے۔ قرآن مجید میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ آدمی کا دامن مرض اور تکلیف میں، غربت اور مالی پریشانی میں، کسی حادثہ اور صدمہ میں، شکوہ اور شکایت سے آلودہ نہ ہو، وہ جزع فزع نہ کرے، اسے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ سمجھ کر برداشت کرے، اسی سے یہ توقع رکھے کہ وہ اس کی تکلیف کو دور کرے گا اور اس کے لیے دعا بھی کرتا رہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آدمی دین حق کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں جو مشکلات پیش آئیں ان پر صبر و ثبات کا مظاہرہ کرے۔ گالیاں سنے، مخالفت برداشت کرے، جان و مال کا نقصان اٹھائے اور اپنا کام جاری رکھے۔ یہ پیغمبرانہ وصف ہے اور ایمان کی علامت ہے، لیکن اس کے مواقع اسی وقت آئیں گے جب کہ آدمی دعوتِ دین کے لیے سعی و جہد کرے۔ جو شخص کارِ دعوت سے بے تعلق ہو اسے استقامت کا یہ پہلو نصیب نہیں ہوسکتا۔

ایک اور مثال لیجیے۔ ہم سب خدا کی راہ میں انفاق کی فضیلت سے واقف ہیں۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی غریبوں، مسکینوں، محتاجوں اور دوسرے مستحق افراد پر صدقہ و خیرات کرے اور اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی توقع رکھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دین کی دعوت و تبلیغ، اس کے فروغ اور اس کی سربلندی کے لیے اپنا مال اور پیسہ خرچ کیا جائے۔ لیکن اس راہ میں انفاق آدمی اسی وقت کرسکتا ہے جب کہ وہ اس کی اہمیت محسوس کرے اور عملاً اس سے دل چسپی لے۔

جماعت اسلامی اسی وجہ سے تربیت کے لیے ضروری سمجھتی ہے کہ آدمی اقامتِ دین کی جدوجہد میں تن من دھن سے لگ جائے۔ اس کے بغیر ان خوبیوں کے پیدا کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔

۴- حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین

قرآن مجید نے کام یابی کے لیے ایمان اور عمل صالح کے ساتھ 'تواصی بالحق' اور 'تواصی بالصبر' کو ضروری قرار دیا ہے۔

ارشاد ہے:

وَ الْعَصْرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾ (العصر)

قسم ہے زمانہ کی، بے شک انسان خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

'تواصی بالحق اور تواصی بالصبر' کی یہ اصطلاح اپنے اندر بڑا وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص دوسرے کا بہی خواہ ہو، بھلائیوں میں اس کی مدد کرے اور برائیوں میں اسے مبتلا ہونے نہ دے، نیکی میں اس کا مخلص ساتھی ہو، برائی میں اس کے لیے سراسر اجنبی بن جائے۔ حق پر استقامت بہت مشکل ہے، اس سے ہٹنے اور منحرف ہونے نہ دے، اس کے لیے تکلیف برداشت کرنے اور استقامت و پامردی دکھانے کی نصیحت کرتا رہے، جرأت اور ہمت بڑھائے، حوصلہ افزائی کرے اور اپنی طرف سے جو تعاون ممکن ہے وہ پیش کرے۔ معاشرہ میں اس کے بغیر نیکیوں کو فروغ نہیں مل سکتا اور برائیاں مٹ نہیں سکتیں اور حق و باطل کی کش مکش میں حق کے سربلند اور باطل کے سرنگوں ہونے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جماعت اسلامی تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے اس پاکیزہ عمل کو تربیت کا ایک اہم ذریعہ تصور کرتی ہے۔ وہ اپنے رفیقوں اور ساتھیوں میں یہ جذبہ پیدا کرنا چاہتی ہے اور اس کی ترغیب دیتی رہتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق پر استقامت کی نصیحت اور اس راہ میں اس کی مدد کریں۔ اپنے کسی ساتھی کے اندر کوئی

غلطی اور خامی دیکھیں تو محبت اور ہمدردی سے اس کی نشان دہی کریں اور اس کی اصلاح کی پورے خلوص سے کوشش کریں۔ اس میں اس کو بدنام کرنے یا اس کے وقار کو مجروح کرنے کا جذبہ قطعاً راہ نہ پائے۔ دوسری طرف جس شخص کو اصلاح کا مشورہ دیا جائے وہ اسے بہ خوشی قبول کرے اور اس کا احسان مانے کہ اس نے مفت میں اس کی ایک بڑی خدمت انجام دی۔ مشورہ دینے اور قبول کرنے والے کے درمیان جہاں یہ جذبہ موجود ہو وہاں یہ توقع رکھنی ہی چاہیے کہ اصلاح ضرور ہوگی۔

۵-نگرانی اور احتساب

ان ہدایات کے ساتھ جماعت اپنے نظم کے تحت اس بات کی مستقل نگرانی کرتی رہتی ہے کہ اس سے وابستہ افراد میں یہی نہیں کہ کوئی دینی اور اخلاقی گراوٹ نہ پیدا ہونے پائے، بلکہ وہ اپنے اخلاق و کردار کے لحاظ سے اوپر اٹھیں۔ نگرانی اور احتساب کا یہ عمل جماعت کے نظم میں نیچے کی سطح سے لے کر اوپر کی سطح تک جاری ہے۔ مقامی ذمہ دار اپنے دائرہ میں نگرانی کا یہ فرض انجام دیتے ہیں اور مرکزی ذمہ دار پوری جماعت کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود جب کوئی شخص مقررہ معیار سے گر جاتا ہے اور اصلاح کی کوششیں ناکام ہوجاتی ہیں تو جماعت اسے اپنے درمیان سے خارج کردینے میں بھی کوئی تامل نہیں کرتی، تاکہ اس کے غلط اثرات دوسرے افراد پر نہ پڑیں اور دین کا کام کرنے والی ایک جماعت بدنامی کا شکار نہ ہو۔

صحیح مقاصد کے لیے جو جماعتیں اٹھتی ہیں وہ بھی بالعموم اس وقت غلط رُخ اختیار کرلیتی ہیں جب ان کے راہ نماؤں پر تنقید کے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ ان کے کسی عمل کا احتساب نہیں ہوتا اور ان کے کسی اقدام پر گرفت نہیں کی جاتی۔ زبان سے چاہے انھیں معصوم نہ کہا جائے، لیکن عملاً انھیں معصومیت کا مقام

حاصل ہوجاتا ہے۔

جماعت اپنے ذمہ داروں کو معصوم عن الخطایا غلطیوں سے محفوظ نہیں سمجھتی۔ وہ بھی انسان ہیں۔ ان سے بھی بھول چوک اور غلطی ہوسکتی ہے۔ جماعت کے نظام میں ذمہ داروں کو مشورے دیے جاسکتے ہیں، ان میں کوئی خامی ہوتو اس کی طرف توجہ دلائی جاسکتی ہے اور ان کی غلطیوں پر ٹوکا جاسکتا ہے۔ جماعتی نظام میں یہ کوئی غیرآئینی یا معیوب بات نہیں ہے، بلکہ جماعت کے ذمہ داروں نے تنقید و احتساب کے اس جذبہ کو ابھارا ہے، وہ اسے زندہ رکھنا اور پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔

آج کی دینی جماعتوں میں غالباً جماعت اسلامی ہی نے اپنے نظام میں اس تنقید و احتساب کو رواج دیا ہے، ورنہ دینی حلقوں میں بزرگوں پرتنقید کی ہمت شاید ہی کوئی کرے اور اگر کبھی ہمت کر بیٹھے تو اس حلقہ سے اس کی وابستگی ہی خطرے میں پڑ جائے۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ جماعت اسلامی تربیت کی ان کوششوں میں پوری طرح کام یاب ہے اور اس سے وابستہ افراد مطلوبہ سیرت و کردار کے حامل ہیں، لیکن اتنی بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اصلاح وتربیت کا جو طریقہ اس نے اپنایا ہے وہ کتاب وسنت کے عین مطابق ہے اور ہمارے دور اوّل کی اسے تائید حاصل ہے۔ (دسمبر ۱۹۸۶ء)

نظامِ تربیت
(اعتراضات کا جواب)

اسلام اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکانے اور دل و جان سے اس کی عبادت و اطاعت میں لگ جانے کا نام ہے۔ اسلام ایسا انسان تیار کرنا چاہتا ہے جو صحیح معنی میں خدا، رسول اور آخرت پر سچا ایمان اور کامل یقین رکھتا ہو، جس کے تمام جذبات اور اعمال اسی ایمان و یقین کے تابع اور اس سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ اس کی زندگی خدا بیزار، اس کے دین سے بے تعلق اور آخرت فراموش انسان کی زندگی سے سراسر مختلف ہو، وہ خدا پرستی کا جیتا جاگتا اور چلتا پھرتا نمونہ بن جائے اور اُسے دیکھ کر اسلام کی تصویر نگاہوں کے سامنے اُبھر آئے۔

جماعت کے نظامِ تربیت کے خاص اجزا

دنیا میں جہاں کہیں بھی تحریکاتِ اسلامی کام کررہی ہیں ان کے پیشِ نظر اسی طرح کی کردار سازی ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر وہ اپنے مقصد میں کام یاب نہیں ہوسکتیں۔ جماعتِ اسلامی ہند بھی اپنے وابستگان میں یہی کردار پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے اس کا ایک نظامِ تربیت ہے، اس کے خاص اجزا یہ ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، رسول کی رسالت اور آخرت کی جزا و سزا پر ایمان اور پختہ یقین پیدا کرنا۔

۲- ایمان کے تقاضوں کا صحیح شعور اور احساس ابھارنا۔
۳- کتاب و سنت کا علم اور اس میں اضافے کی مسلسل کوشش کرنا، تاکہ اسلامی فکر میں پختگی پیدا ہو، اس کے مطابق زندگی گزاری جاسکے اور دنیا کے سامنے دین کی بہتر ترجمانی ہوسکے۔
۴- عبادات کا اہتمام اور ان میں اخلاص، تقویٰ اور احسان کی کیفیت پیدا کرنا۔
۵- انفرادی و اجتماعی کردار کی اس طرح تعمیر جس طرح قرآن و حدیث چاہتے ہیں۔
۶- احتساب کا جذبہ پیدا کرنا، تاکہ انسان اپنے اعمال کا مستقل جائزہ لیتا رہے۔
۷- دعوت اور اصلاحِ امت کا جذبہ پیدا کرنا اور اس کی صلاحیت کونشو ونما دینا۔
۸- اس امر کی کوشش کہ جماعت کا داخلی نظم مستحکم ہو، تاکہ جماعت بنیانِ مرصوص بنی رہے۔

یہ مقاصد الفاظ کے اختلاف کے ساتھ جماعتِ اسلامی کی پالیسی میں ہمیشہ شامل رہے ہیں اور وہ اس کے حصول کے لیے کوشاں بھی رہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آدمی کے سامنے اعلیٰ نصب العین ہو اور اُسے پاکیزہ مقصدِ حیات مل جائے تو اس کی سیرت و کردار میں بھی بلندی آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ جماعتِ اسلامی ہند، اپنے سامنے اقامتِ دین جیسا پاکیزہ نصب العین رکھتی ہے۔ یہ پیغمبرانہ نصب العین ہے۔ یہی ہر مسلمان کا نصب العین اور اس کی دلی تمنا اور اس کی آرزوؤں کا مرکز ہے۔ اسلام کی اقامت اور اس کی سربلندی کے سوا کوئی دوسرا نصب العین کسی بھی مسلمان کا ہو ہی نہیں سکتا۔

اس میں شک نہیں کہ جماعت کی کوشش سے اس سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی اصلاح و تربیت کی طرف متوجہ ہیں۔ ان کے اندر دین سے بے رغبتی تھی تو وہ دور ہوئی ہے۔ بہ حیثیتِ مجموعی ان کے دینی رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ

سے ایک گونہ تعلق ان میں محسوس ہوتا ہے اور ان کا کردار بھی بہتر ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود قرآن و حدیث نے جو بلند معیار پیش کیا ہے، خیال ہوتا ہے کہ اس معیار تک پہنچنے کے لیے ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی ہوں گی۔

بعض اعتراضات

۱- جماعت کی فکر پر سیاست کا غلبہ ہے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جماعت نے اقامتِ دین کو سیاسی رُخ دے دیا ہے۔ اس لیے اس سے سیاسی ذوق وشوق اور سیاسی تبدیلی کا رجحان تو پیدا ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے، لیکن دینی جذبات، تعلق باللہ اور تعبُّدی کیفیات نہیں ابھرپاتیں۔

یہ بات اس لیے صحیح نہیں ہے کہ جماعتِ اسلامی کا نصب العین خالص دینی ہے۔ دین جس حد تک سیاسی ہے اس حد تک یہ سیاسی ہے، نہ اس سے کم نہ زیادہ۔ سوال یہ ہے کہ کیا سیاست دین کے دائرے سے خارج ہے؟ کیا سیاست کے معاملے میں اسلام کوئی رہ نمائی نہیں کرتا؟ اگر سیاست میں بھی اس کی رہ نمائی موجود ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ واقعی اس نے رہ نمائی کی ہے، تو سیاست کو بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تابع ہونا چاہیے۔ جماعتِ اسلامی کہتی ہے کہ انسان کسی بھی معاملے میں، چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، خود مختار اور آزاد نہیں ہے، اسے دینی، اخلاقی، روحانی، معاشرتی اور اقتصادی، ہر شعبہ حیات میں اس سے رہ نمائی حاصل کرنی چاہیے، سیاست بھی اس میں داخل ہے۔ اگر سیاست کو دین سے الگ کردیا جائے تو دین ناقص ہوگا اور پوری زندگی کے لیے اس کی رہ نمائی نہ ہوگی اور دنیا گندی سیاست اور اس کے جوروستم کی شکار رہے گی ؏

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

آج دنیا بے دین سیاست کے کڑوے کسیلے پھل کھانے پر مجبور ہے۔ کیا اسلام کے ماننے والوں کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اس سے اُسے بچانے کی فکر کریں؟

ایک دوسرے پہلو سے بھی اس پر غور کیا جانا چاہیے، وہ یہ کہ اگر آج سیاست کو دین سے الگ کردیا جائے تو کل اس کے قانونِ معاشرت و معیشت کو بھی الگ کرنے کا تصور ابھر سکتا ہے اور کسی نہ کسی عنوان سے کہا جاسکتا ہے، بلکہ کہا جارہا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب اسی قانون کی پیروی ہے، مسلمان اس کے پابند رہتے ہوئے ترقی نہیں کرسکتے۔ آج ہم سیاست کو دین سے الگ کردیں اور کل معیشت و معاشرت کو بھی الگ کرنے کے لیے تیار ہوجائیں تو اللہ کا دین رہبانیت بن کر رہ جائے گا اور پوری زندگی پر غیرالٰہی نظریات کی حکومت ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے کردار میں خامی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم سیاست کو دین کا حصہ سمجھتے ہیں، بلکہ اس کے اسباب کچھ اور ہوسکتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی زندگی میں دین اور سیاست کا اجتماع تھا، اس کے ساتھ ان کی زندگیاں قیامت تک کے لیے نمونہ بن گئیں۔

۲- عبادات کو مقصود نہیں، بلکہ ذریعہ سمجھا جاتا ہے

تربیتی مقاصد میں ہماری ناکامی کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہم نے عبادات اور دین کے بہت سے احکام اور تقاضوں کو اس طرح پیش کیا ہے گویا کہ وہ فی نفسہٖ مقصود اور مطلوب نہیں ہیں، بلکہ اقامتِ دین کے نصب العین کے لیے محض ایک ذریعہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذریعہ کی اہمیت اصل کے مقابلے میں کم ہوتی ہے، اس لیے ہماری توجہ عبادات، دین کے دیگر فرائض و واجبات اور احکام کی طرف اس طرح نہیں ہوسکی جس طرح ہونی چاہیے۔

میرے خیال میں یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اقامتِ دین جماعت کا

نصب العین ہے، اس کی فطری ترتیب جماعت نے یہ بیان کی ہے کہ پورا دین پہلے انسان کی ذات پر قائم ہو، اس کے بعد اپنے قریبی ماحول میں اور پھر پوری دنیا میں اسے قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔

دین میں جتنے فرائض و واجبات ہیں ان میں سے ہر ایک میں اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ پورے دین پر عمل کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور انسان کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ دین پر عامل اور اس کا حامل بن سکے۔ یہی معنیٰ ہیں ہمارے نزدیک ان کے ذریعہ ہونے کے۔ ہم نے اس معنی میں ان کو ذریعہ نہیں کہا ہے کہ اقامتِ دین کے بہت سے ذرائع میں سے ایک ذریعہ عبادات بھی ہیں۔ ان کو چھوڑ کر یا اُن سے غفلت برت کر کچھ اور ذرائع سے بھی دین قائم ہوسکتا ہے اور نہ اس معنی میں ذریعہ کہا ہے کہ اقامتِ دین ہوجائے تو اس کی ضرورت ختم ہوجائے گی۔

۳- جماعت کا لٹریچر باطنی کیفیات نہیں پیدا کرتا

ایک خیال یہ ہے کہ جماعت کا لٹریچر اور اس کے ذمہ داروں کی تقریریں اور تحریریں خارج میں تو انسان کے لیے میدانِ کار فراہم کرتی ہیں، لیکن داخل میں حرکت یا تبدیلی نہیں پیدا کرتیں۔ اُن سے دنیا کو بدلنے کا جوش اور جذبہ تو ابھرتا ہے، لیکن خود کو بدلنے کی فکر اور تڑپ نہیں پیدا ہوتی۔ اس لیے تربیت کے جو مقاصد ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کا سامان ہمارے یہاں موجود نہیں ہے۔

یہ بات بھی میرے خیال میں ایک ناروا بات ہے۔ ہمارا لٹریچر اور ہماری تقریریں جہاں یہ بتاتی ہیں کہ اقامتِ دین کا کام کس طرح کیا جائے؟ غیر اسلامی نظامِ فکر کو بدل کر اسلامی فکر کیسے پیدا کی جائے؟ موجودہ تہذیب و معاشرت، معیشت و سیاست اور اخلاق و عادات میں کس طرح مطلوبہ تبدیلی لائی جائے؟

وہیں ہمارے لٹریچر میں صراحت کے ساتھ یہ بھی بیان ہوا ہے کہ عبادات کی کیا اہمیت ہے؟ ان میں کیا کیفیات مطلوب ہیں؟ اللہ تعالیٰ ہمیں کن صفاتِ عالیہ سے آراستہ اور کن رذائل سے پاک دیکھنا چاہتا ہے؟ ہمیں کن اعمال کو اختیار کرنا چاہیے اور کن اعمال سے اجتناب ہمارے لیے ضروری ہے؟ یہ بات درست ہے کہ دعوتی اور تحریکی مقصد کے تحت جماعت نے وسیع لٹریچر فراہم کیا ہے اور تربیتی مقاصد پر نسبتاً کم لکھا گیا ہے۔ لیکن جس حد تک تربیتی مقاصد پر لکھا گیا ہے اس میں اس کی اہمیت پوری طرح اجاگر کی گئی ہے۔ اس کے ثبوت میں مولانا مودودیؒ کا رسالہ 'تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'، 'اسلامی تزکیۂ نفس' اور بعض دوسری تحریریں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مولانا مودودیؒ کی اس طرح کی تحریروں کو خلیل حامدی صاحب مرحوم نے 'تحریک اور کارکن' کے عنوان سے جمع کردیا ہے۔ مولانا مودودیؒ کے علاوہ جماعت کے دیگر ذمہ داروں نے بھی اس طرف توجہ دی ہے۔ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کی کتاب 'اساسِ دین کی تعمیر' اسی ذیل میں آتی ہے۔ جس میں ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ، نماز اور صبر پر کتاب و سنت کی روشنی میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی کتاب 'تزکیۂ نفس' اور 'حقیقتِ تقویٰ' ایک طرح سے رفقاء جماعت کے نصاب کا جزء رہی ہیں۔ مولانا سیّد احمد عروج قادریؒ کی کتاب 'اسلامی تصوف' اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مولانا سید حامد علی مرحوم کی بعض تحریریں بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ خرم مراد مرحوم کی کتابوں سے بھی مستقل استفادہ ہوتا رہا ہے۔ اس عاجز کی کتاب 'اسلام کی دعوت' خاص طور پر اس کے باب 'ضروری اوصاف' کا نام بھی اسی ذیل میں لیا جاسکتا ہے۔

یہی حال ہماری تقریروں کا ہے۔ جماعت کے ذمہ داروں کی تقریریں دعوتی اور تربیتی دونوں پہلوؤں سے ہوتی ہیں اور دونوں ہی مقاصد ان کے پیشِ نظر

ہوتے ہیں۔ جماعت کے اجتماعات بھی جس طرح دعوتی مقاصد کے لیے ہوتے ہیں اسی طرح تربیتی مقاصد کے پیشِ نظر بھی ہوتے ہیں۔

۴- تربیت کے ذرائع ناکافی ہیں

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تربیتی مقاصد کے لیے جو ذرائع ہم نے اختیار کیے ہیں وہ غلط تو نہیں ہیں، البتہ ناکافی ہیں۔ اس طرح کے مشورے دینے والوں کے سامنے بالعموم تربیت کا خاص تصور، خاص مقصد اور خاص ذرائع ہوتے ہیں، جو جماعت کے تصورِ تربیت، مقصدِ تربیت اور ذرائع تربیت سے الگ ہیں۔ جماعت کی مجبوری یہ ہے کہ وہ کوئی چیز کتاب وسنت سے ہٹ کر لینا نہیں چاہتی۔ ہاں کسی ایسی بات کی نشان دہی کی جائے جو کتاب وسنت میں موجود ہو اور اسے اختیار نہ کیا گیا ہو تو اسے اختیار کرنے میں جماعت کو کبھی کوئی تامل نہ ہوگا۔ لیکن اب تک ایسی کسی بات کی نشان دہی نہیں کی جاسکی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جماعت کے نظامِ تربیت پر قرآن وحدیث کی روشنی میں شاید کوئی مضبوط اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس کے ذیل میں مختلف تأثرات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تأثرات کا حقیقت پر مبنی ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس میں آدمی کے ذوق، رجحان، کسی خاص عمل اور ردِ عمل کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ بعض اوقات انفرادی تجربات یا خامیوں کو عمومی شکل دے دی جاتی ہے۔ اس سب کے باوجود ہمیں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف اور انھیں دور کرنے کی فکر بہ ہر حال کرنی چاہیے۔

(غیر مطبوعہ)

(یہ مختصر سا مضمون ایک طویل عرصہ قبل لکھا گیا تھا۔ اب نظرِ ثانی کے بعد اسے اس مجموعہ میں شامل کیا جارہا ہے۔)

تربیت کے لیے بعض مشورے

ہماری دینی اور اخلاقی خامیوں کا ایک علاج یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ تربیتی لٹریچر میں اضافہ کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ تربیتی اجتماعات کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اور اس طرح کے ذریعوں سے تذکیر اور یاد دہانی ہوتی ہے اور اپنی اصلاح کے جذبے کو تحریک اور تقویت ملتی ہے۔ اس کی افادیت کو تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو لٹریچر موجود ہے یا جو اجتماعات عملاً ہو رہے ہیں ان سے جب ہم پورا فائدہ نہیں اٹھا پا رہے ہیں تو مزید لٹریچر اور اجتماعات سے کیا کسی بڑی تبدیلی کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اگر ہمارے اندر اصلاح کا جذبہ اور اپنی تربیت کی فکر ہو تو موجودہ لٹریچر بھی کام کر سکتا ہے اور مزید لٹریچر بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے، ورنہ لٹریچر زیادہ سے زیادہ موجود تو ہوگا، لیکن ہم فائدہ نہیں اٹھا پائیں گے۔ چناں چہ یہی دیکھا جا رہا ہے کہ الحمدللہ لٹریچر میں وقت کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اور اصلاح و تربیت کے پہلو سے بھی نئی نئی تحریریں آ رہی ہیں۔ لیکن اُن سے جیسا فائدہ اٹھانا چاہیے، نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ ہمارے اندر جو خامیاں ہیں، وہ ابھی برقرار ہیں۔

نظامِ تربیت سے فائدہ اٹھانے کی تدابیر

تربیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے یا تربیت کے نظام کو کارگر بنانے کے

لیے اس وقت بعض تدابیر رفقاء جماعت کے لیے پیش کی جارہی ہیں۔ ان کی طرف پوری توجہ اور اہتمام ہوتو توقع ہے کہ اس سے ہمیں اپنی اصلاح میں مدد ملے گی اور جو وسائل و ذرائع حاصل ہیں ان سے زیادہ نفع پہنچے گا۔

۱- نصب العین کا گہرا شعور

اصلاح کے لیے پہلا اور ضروری قدم یہ ہے کہ جس نصب العین کو ہم نے اختیار کیا ہے اس کی اہمیت و عظمت ہمارے دل و دماغ میں جاگزیں ہو، جس مقصد کو ہم نے اپنے لیے منتخب کیا ہے اور جس کے تحت جماعت وجود میں آئی ہے، ہمارا یقین ہے کہ وہ دنیا کا سب سے ارفع اور اعلیٰ نصب العین ہے۔ یہ نصب العین ہے خدا کو بھولے ہوئے انسانوں کو اس کی طرف بلانا، بھٹکی ہوئی دنیا کو صراطِ مستقیم دکھانا، خدا پرستی، اس کی اتباع اور بندگی کی دعوت دینا، آخرت کی جزا و سزا کا تصور ابھارنا، اللہ کے دین کی بنیاد پر فرد کی زندگی اور معاشرہ کی تعمیر کرنا اور دنیا میں اسے قائم و غالب کرنے کی جدوجہد کرنا۔ یہ پورے عالم میں عقیدہ و عمل کا ایک زبردست انقلاب ہے جو ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ اخلاق، تہذیب، معاشرت و معیشت اور سیاست کو نیا رُخ دینے کی کوشش ہے۔ اس سے بڑی کوشش اور اس سے بڑے انقلاب کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک اس کے داعیوں میں وہ کردار نہ ہو جس کا یہ عظیم نصب العین تقاضا کرتا ہے، روئے زمین پر اس کا قائم ہونا ممکن نہیں ہے۔ جس شخص کا سینہ خدا اور آخرت کے خوف سے خالی ہو وہ دوسروں کو خدا پرست کیسے بنا پائے گا؟ جو مکارمِ اخلاق سے تہی دامن ہو اور رذائلِ اخلاق میں لت پت ہو، کیسے ممکن ہے کہ وہ دوسروں کو اخلاقِ عالیہ سے آراستہ کردے؟ جو ظلم وجور کی راہ پر چل رہا ہو اس کے ہاتھوں عدل و انصاف کا قیام کیوں کر ہوسکتا ہے؟ جو خود دوسروں کے حقوق تلف کرے وہ انسانوں کے حقوق کا محافظ اور پاسبان کیسے ہوگا؟

آدمی جب کوئی بڑا کام کرنے اٹھتا ہے تو اسی مناسبت سے اپنی صلاحیتوں کو فروغ دیتا اور جو خامیاں ہیں انھیں دور کرتا ہے۔ اگر اقامتِ دین کا عظیم نصب العین ہمارے دل و دماغ پر چھا جائے تو خامیوں کو دور کرنے کا جذبہ اندر سے اٹھے گا اور ہمارے اندر مطلوبہ کردار بھی پیدا ہوگا۔ اس نصب العین کا شعور ہی کم زور ہوجائے تو اس کے مطابق کردار کی توقع بھی نہیں کی جاسکے گی۔

۲- آخرت کا استحضار

اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کیا جائے، بلکہ ہر وقت دل و دماغ میں مستحضر رکھا جائے کہ ہماری تمام تر جدوجہد اور تگ و دو کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور آخرت کی کام یابی ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا اور ہر چھوٹے بڑے عمل کا جواب دینا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال:۷-۸)

پس جس کسی نے ذرہ برابر بھلائی کی اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی اسے (بھی) دیکھ لے گا۔

کام یاب وہ ہے جو آخرت میں کام یاب قرار پائے۔ جو وہاں ناکام رہا وہ ہمیشہ کے لیے ناکام رہا، اس کی کام یابی کی کوئی صورت نہیں ہے:

وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝ (الاعراف:۸-۹)

وزن اس روز حق کے ساتھ ہوگا۔ جن کے پلڑے (نیکیوں کی وجہ سے) بھاری ہوں گے وہی فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے پلڑے (بدعملیوں کی وجہ سے) ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں ڈالنے والے ہوں گے۔ اس وجہ سے کہ وہ ہماری آیات کے ساتھ زیادتی کررہے تھے۔

اسی معنی میں یہ صراحت بھی ہمارے سامنے موجود رہے:

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ﴿۹﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ؕ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾ (القارعۃ:۶-۱۱)	پس جس کے پلڑے (نیکیوں کی وجہ سے) بھاری ہوں گے وہ من پسند عیش میں ہوگا اور جس کے پلڑے (بدی کی وجہ سے) ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانا (جہنم کا) گڑھا ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ وہ کیا ہے؟ دہکتی ہوئی آگ ہے۔

قرآن مجید میں خدا ترس اور متقی انسانوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ ان کے دل و دماغ پر آخرت کی فکر چھائی رہتی ہے اور اس سے وہ ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں:

اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَ هُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ (الانبیاء:۴۹)	وہ جو اپنے رب سے اسے دیکھے بغیر ڈرتے ہیں اور جن کو قیامت کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔

یہ مضمون دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

وَ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۚ﴿۲۷﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾ (المعارج:۲۷-۲۸)	وہ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ بے شک ان کے رب کے عذاب سے کسی کو بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔

قرآن و حدیث کے وہ اجزا، جن میں قیامت کے ہول ناک دن کی منظر کشی کی گئی ہے اور آخرت کی باز پرس، وہاں کے حساب و کتاب اور ابدی جزا و سزا کا ذکر ہے، انھیں بار بار پڑھتے رہنا چاہیے اور درس و تذکیر کی مجلسوں کا انھیں موضوع بنانا چاہیے۔ اس سے نیکیوں کا رجحان فروغ پائے گا اور معصیت سے دامن کش رہنے کا جذبہ ابھرے گا۔ آخرت کی فکر ہی اللہ تعالیٰ سے انسان کے تعلق کو استوار کرتی اور اس کے کردار کو رفعت عطا کرتی ہے۔ اس کے بغیر وہ کردار ہی وجود میں نہیں آسکتا جو اسلام کو مطلوب ہے۔ آخرت کا خوف اور وہاں کی کام یابی کی تمنا ہی نے صحابۂ کرام کی سیرت کو وہ بلندی عطا کی جس پر تاریخ ناز کرتی ہے اور جس سے زیادہ بلندی کا انسانی ذہن تصور بھی نہیں کرسکتا۔

۳- قرآن و حدیث اور دینی لٹریچر کا مطالعہ

اس بات کی بھرپور کوشش کی جائے کہ قرآن مجید، حدیث شریف اور دینی لٹریچر سے ہمارا مسلسل اور غیر منقطع تعلق قائم رہے۔ آدمی کو درس، تذکیر، تقریر اور وعظ و نصیحت سے بھی فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے یقیناً فائدہ اٹھانا چاہیے۔ نیکی اور بھلائی کی بات جس کسی کی زبان سے بھی سننے کو ملے اور جس وقت بھی ملے، متاعِ گم گشتہ سمجھ کر اُسے اپنا لینا چاہیے اور اس سے استفادہ کی راہ میں کسی قسم کے ذہنی تحفظ یا تعصب کو حائل نہیں ہونے دینا چاہیے، لیکن تقریر اور خطاب سے استفادہ کے مواقع کبھی کبھی ملتے ہیں، البتہ ہم چاہیں تو قرآن و حدیث اور دینی کتابوں سے جب چاہیں اپنا رشتہ جوڑ سکتے ہیں، اور یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ کس طرح کا انسان ہمیں بنانا چاہتے ہیں اور ہمارے اندر کن خوبیوں کو پروان چڑھانا اور کن خامیوں سے ہمیں پاک دیکھنا چاہتے ہیں؟

قرآن و حدیث کا مطالعہ محض معلومات میں اضافہ کے لیے نہیں، بلکہ اپنی اصلاح و تربیت کے لیے ہو تو اس کا ہر ورق اصلاح و تربیت کا سامان فراہم کرے گا۔ قرآن و حدیث کے مطالعے سے اگر کوئی خوبی آدمی اپنے اندر دیکھے تو اللہ کا شکر بجالائے اور مزید توفیق طلب کرے۔ جن خامیوں کی وہ نشان دہی کریں بغیر کسی توجیہ کے انھیں تسلیم کرے، غلطی و خامی کا اعتراف کرے، توبہ و استغفار کرے اور اصلاح کا جو نسخہ وہ تجویز کریں اُسے اختیار کرنے کے لیے فوراً آمادہ ہو جائے۔ زندگی اگر غفلت کی نذر ہوگئی ہے اور خامیوں سے بھری ہوئی ہے، تب بھی آدمی کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اپنی ایک ایک غلطی کو ہدف بنائے اور متعینہ مدت میں اس پر قابو پانے اور اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

۴- عزم و ارادہ

تربیت کا اصل مقصد انسان کے باطن کو تبدیل کرنا ہے۔ یہ تبدیلی انسان کے اپنے عزم و ارادے سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہمارے اندر اپنے آپ کو بدلنے کا ارادہ نہیں ہے تو نہ کوئی لٹریچر ہمیں بدل سکتا ہے اور نہ کسی تربیتی پروگرام سے ہمارے اندر تبدیلی آ سکتی ہے، عزم و ارادہ ہو تو اصلاح و تربیت کا ہر جملہ ہمارے اندر حرکت پیدا کرسکتا ہے۔ اس حرکت سے ہم عرصے تک بلکہ مستقل فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اصلاح کی فکر نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ ہم اچھی سے اچھی نصیحت کو بھی بے توجہی سے سنیں گے اور دامن جھاڑ کر مجلس سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

۵- قائدین کا کردار

ایک خاص بات، جو خالص نفسیاتی ہے اور جس کی طرف ہر سطح کے ذمہ داروں کو توجہ کرنی چاہیے، یہ ہے کہ انسان کے اندر تقلید کا مادہ زیادہ اور اجتہاد کا کم ہے۔ وہ خود سے کسی ایسے راستہ پر چل نہیں پاتا جس پر دوسرے لوگ چل نہ رہے ہوں، البتہ کچھ لوگوں کو کسی طرف چلتا ہوا دیکھے تو اس کے قدم بھی اُسی طرف اٹھنے لگتے ہیں۔ ہمارے اندر ایسے افراد ہونے چاہئیں جن پر اللہ کا دین پوری طرح چھایا ہوا ہو، جو دن کے شہ سوار اور رات کے راہب ہوں، جن کی زبان ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر رہتی ہو، اللہ کے دین کے لیے ان کی تڑپ کو دیکھ کر دوسرے تڑپ اٹھتے ہوں، جن کی عبادات دوسروں میں عبادت کا جذبہ پیدا کریں، جن کا ایثار و قربانی دوسروں کے اندر ایثار و قربانی کا جوش بھردے، جن کے عزم و حوصلے اور استقامت سے بے حوصلہ افراد، حوصلہ و استقامت سیکھیں، جن کی سیرت و کردار دوسروں کے اندر اپنی اصلاح کی تحریک پیدا کردے۔ اس طرح کے افراد سے جماعت الحمدللہ بالکل خالی نہیں ہے۔ ان کے اندر خامیاں بھی ہوں گی، لیکن

ان کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے۔ ایک تو ان کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے، تا کہ جماعت اور اس کے افراد جہاں کہیں بھی موجود ہوں ان کے سامنے کوئی نہ کوئی شخصیت پائی جائے، جسے وہ نمونہ کے طور پر اپنے سامنے رکھیں۔ دوسری طرف جماعت کے ارکان اور متاثرین میں اس طرح کے افراد سے فائدہ اٹھانے کا جذبہ پایا جانا چاہیے۔ اگر یہ جذبہ مفقود ہو تو کسی بھی اعلیٰ کردار کے انسان میں کوئی نہ کوئی خامی ڈھونڈ لی جائے گی اور اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جائے گا۔

۶- دعا

اس سلسلے کی اہم چیز اللہ تعالیٰ سے دعا ہے۔ دعا عبادت ہے۔ دعا روحِ عبادت ہے۔ دعا اپنی بے بسی اور بے کسی کا اظہار ہے۔ دعا اس بات کی علامت ہے کہ ہم اپنے اندر کمی محسوس کرتے ہیں اور اسے دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے دامن پھیلائے ہوئے ہیں۔ دعا سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے۔ دعا اللہ تعالیٰ سے قربت کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ جس شخص کے ہاتھ اللہ تعالیٰ کے حضور نہ اٹھیں وہ بدقسمت ہے۔ وہ کبر و غرور میں مبتلا ہے اور کبر و غرور اللہ کے غضب کو بھڑکاتا ہے۔ حکم ہے: دعا کی جائے اور تضرّع اور زاری سے کی جائے، بہت ہی خاموشی سے اور چپکے چپکے کی جائے:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (الاعراف:۵۵)

اپنے رب کو پکارو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے۔ بے شک وہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس کے ساتھ مزید فرمایا کہ دعا اس طرح ہو کہ ایک طرف اللہ کی گرفت اور اس کے عذاب کا خوف دامن گیر ہو اور دوسری طرف اس سے امیدِ کرم اور اس کی رحمت و نوازش کی توقع بھی ہو۔ بندہ خوف و رجا کے درمیان کھڑا ہو کر اللہ کو پکارے۔ یہ محسنین کی صفت ہے اور اللہ کی رحمت محسنین کے قریب ہوتی ہے:

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ (الاعراف:۵۶)
اور پکارو اس کو خوف اور طمع کے ساتھ، بے شک اللہ کی رحمت محسنوں کے قریب ہے۔

دعا اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی نمایاں خوبی ہے۔ ان کی زندگی پر نظر ڈالیے اور ان کی دعا کی کیفیت دیکھیے:

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا ؕ وَ كَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾ (الانبیاء:۹۰)
وہ بھلائی کے کاموں میں دوڑتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف سے پکارتے تھے اور ہمارے سامنے جھکے ہوئے تھے۔

اللہ سے تعلق کو مضبوط کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کی صحبت و معیت اور رفاقت اختیار کی جائے جو شب و روز اللہ تعالیٰ کے ذکر وفکر اور دعا میں مشغول ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے اور اس میں ہم سب کے لیے رہ نمائی ہے:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ (الکہف:۲۸)
اپنے جی کو ان لوگوں کے ساتھ جمائے رکھو جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں اس کی رضا کی طلب میں۔ تمہاری نگاہیں ان سے نہ ہٹیں حیات دنیا کی زینت چاہتے ہوئے۔

دعا سے اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ دعا کارِ ثواب ہے۔ دعا سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ دعا سے مراد پوری ہوتی ہے۔ اللہ سے مانگنے والا محروم نہیں ہوتا۔ اللہ کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ کوئی اس سے بھیک مانگے اور وہ اسے خالی ہاتھ لوٹا دے۔ حضرت زکریاؑ بڑھاپے میں اولاد کی دعا کرتے ہیں اور کس یقین کے ساتھ کہتے ہیں:

وَّ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿۴﴾ (مریم:۴)
اے میرے رب! میں تجھ سے دعا مانگ کر کبھی بے مراد نہیں رہا۔

حضرت زکریاؑ کو حضرت یحیٰؑ جیسی اولاد ملتی ہے۔ اگر آدمی خدا کے سامنے ہاتھ پھیلا کر پورے خلوص اور صدقِ دل کے ساتھ دعا کرے کہ وہ اس کے گناہوں کو معاف کردے، اس کی غفلت کو دور کردے، دنیا کی محبت دل سے نکال دے، آخرت کی فکر پیدا کردے تو یقیناً اس کی دعا سنی جائے گی اور اسے ایک نئی زندگی ملے گی۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لیے خود کو اس کے سامنے پیش کردے تو امید ہے کہ اس سعادت سے وہ محروم نہ ہوگا۔ اس کی توفیق اسے ملے گی:

وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ۝۶۰

تمہارے رب نے کہا ہے کہ تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار سنوں گا۔ بے شک جو لوگ میری بندگی سے تکبر کرتے ہیں وہ جہنم میں ذلیل ہوکر داخل ہوں گے۔ (المؤمن: ۶۰)

اللہ تعالیٰ انسان کی دعا سننے اور اس کی مرادیں پوری کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ بھی اس کی اطاعت و فرماں برداری کے لیے تیار ہوجائے:

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ۝۱۸۶

جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو بتاؤ کہ میں قریب ہوں۔ دعا مانگنے والے کی دعا کو، جب وہ دعا کرے، قبول کرتا ہوں۔ پس وہ میری پکار پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ راہِ ہدایت پائیں۔ (البقرۃ: ۱۸۶)

مانگنے والا جب اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے اور اس کی شرائط پوری کردیتا ہے تو اس کا دامن مراد بھر جاتا ہے۔

(غیر مطبوعہ)

پالیسی اور طریقۂ کار

ماضی قریب کی تاریخ میں ہمارے ملک میں مسلمانوں کے اندر جو تحریکیں اٹھیں، وہ یا تو قومی تحریکیں تھیں یا اصلاحی تحریکیں۔ قومی تحریکوں نے مسلمانوں کے سیاسی مسائل میں دل چسپی لی اور ان کے سیاسی حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح کی تحریکوں کا مزاج ہی شاید کچھ اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ دوسری قومیں حریف بن جاتی ہیں۔ وہ ان کے جائز مطالبات کو بھی بعض اوقات ایک حریف قوم کے مطالبات کی حیثیت سے دیکھنے لگتی ہیں، اس طرح ایک کش مکش کی فضا شروع ہوجاتی ہے۔ اس فضا میں وہ قومیں جن سے کش مکش جاری ہے، اسلام کو اپنے مدِ مقابل کے مذہب کی حیثیت سے تو دیکھ سکتی ہیں، اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور نہیں کرسکتیں۔ اصلاحی تحریکوں کا خطاب صرف مسلمانوں سے رہا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے عقائد، اخلاق اور معاشرت کی اصلاح کی کوشش کی، لیکن اس طرف کوئی خاص توجہ ان کی نہیں رہی کہ اسلام کو دوسرے حلقوں تک پہنچایا جائے اور اس کے بارے میں ان کی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے۔

دیگر تحریکوں کے مقابلے میں جماعت کا امتیاز

جماعت اسلامی نے شروع ہی سے قومی کش مکش سے دامن بچائے رکھا

اور اصلاحی تحریکوں کی طرح اس کا دائرہ کار صرف مسلمانوں تک محدود بھی نہیں رہا۔اس کا خطاب مسلمانوں سے بھی ہے اور غیر مسلموں سے بھی۔ وہ مسلمانوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں اور خیر امت ہونے کا ثبوت دیں۔ وہ غیر مسلموں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اسلام پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کریں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر اس کے حق ہونے پر ان کے دل گواہی دیں تو آگے بڑھ کر اسے قبول کریں۔ اس معاملہ میں وہ کسی لالچ اور زور زبردستی کو غلط اور ناجائز تصور کرتی ہے۔ بلا شبہ اس کا کام زیادہ تر مسلمانوں ہی کے درمیان ہے اور اس کے لٹریچر کا بیش تر حصہ بھی مسلمانوں ہی سے متعلق ہے، لیکن اس کا رجحان ہمیشہ یہ رہااور اس کی اس نے پوری کوشش کی کہ اسلام کو صرف مسلمانوں کا مذہب نہ سمجھ لیا جائے اور ایسا رویہ نہ اختیار کیا جائے کہ غیر مسلموں کے دلوں کے دروازے اسلام کے لیے بند ہوجائیں۔

جماعت اسلامی اور سیاست

دعوت کے ساتھ جماعت اسلامی نے سیاست میں بھی خالص اسلامی نقطۂ نظر اپنایا ہے۔ بہت سے دینی حلقے سیاست کو عملاً شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں۔ وہ اِس 'گندگی' سے الگ رہنا چاہتے ہیں، اسے پاک کرنے کی کوشش بھی ان کے نزدیک ایک ناپاک کوشش ہے۔ اپنے اس رویہ کی وہ خود بہتر توجیہہ کرسکتے ہیں، لیکن ہمارے خیال میں اس کے پیچھے ایک خاص قسم کا خانقاہی ذہن ہے۔ ہوسکتا ہے یہ ذہن بعض لوگوں کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہو اور اس میں وہ کشش بھی محسوس کرتے ہوں، لیکن دین سے اس کا تعلق جوڑنا بہت مشکل ہے۔

دین ہماری پوری زندگی کے لیے ایک مربوط نظامِ فکر و عمل فراہم کرتا

ہے۔ اس میں سیاست بھی داخل ہے۔ اس لیے جماعت اسلامی سیاست کو نہ تو دین سے خارج سمجھتی ہے اور نہ کل دین، بلکہ اسے وہ دین کا ایک ضروری اور لازمی جز تصور کرتی ہے اور اسی حیثیت سے اس کا تعارف کراتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح موجودہ سیاست کا رخ بھی غلط ہوگیا ہے اور اس نے پوری دنیا کو فتنہ و فساد سے بھر دیا ہے۔ لیکن اس کا جن لوگوں کو احساس ہے وہ یا تو اپنے مفادات کے تحت خاموش اور مہر بہ لب ہیں، یا محض چٹکلوں اور نسخوں سے اس کا علاج کرنا چاہتے ہیں، حالاں کہ اس کی اصل وجہ اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ اور اس کے قانون سے بے نیازی ہے۔ کسی فرد، ادارہ یا ریاست کو خدا کے قانون سے بے نیاز ہوکر حکم رانی کا حق دیا جائے گا تو وہ بے لگام ہو ہی جائے گا اور بے لگام طاقت جو بھی کر گزرے وہ کم ہے۔ اس بنیادی حقیقت سے عام طور پر چوں کہ غفلت برتی جاتی ہے، اس لیے جماعت پورے زور اور قوت کے ساتھ اس طرف توجہ دلاتی ہے۔ اس پر کہا جاتا ہے کہ جماعت پر سیاست سوار ہے اور اس نے دین کو سیاست بنادیا ہے۔

ملکی اور بین الاقوامی مسائل میں جماعت کا موقف

پوری دنیا اس وقت سخت اخلاقی بحران سے دوچار ہے، ہر طرف ظلم و ناانصافی ، معاشی استحصال، لوٹ کھسوٹ، عدم مساوات، تعصب اور تنگ نظری نے اپنے خون آشام پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ جن قوموں کے مہذب اور بااخلاق ہونے کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں، ان کی تہذیب اور اخلاق کے کچھ 'حدود' ہیں۔ ان سے وہ آگے نہیں بڑھتے۔ یہ قومیں آپس میں تو بہت مہذب اور بااخلاق نظر آتی ہیں، لیکن دوسری قوموں کے حق میں ان کی روش تہذیب و اخلاق سے گری ہوئی

اور انتہائی ناشائستہ ہوتی ہے۔ وہ عدل و انصاف، مساوات، جان ومال کے احترام، راستی، دیانت و امانت اور وفائے عہد جیسی اخلاقی قدروں کا شب و روز چرچا کرتی رہتی ہیں اور یہ کہنے میں تکلف بھی نہیں ہے کہ ان کے درمیان اس کا بڑی حد تک رواج بھی ہے، لیکن ان اقدار کو انھوں نے قومی نقطۂ نظر سے مفید سمجھ کر اپنایا ہے، اس لیے قومی مفادات سے جب یہ قدریں ٹکراتی ہیں تو ان کے پامال کرنے میں بھی انھیں تامل نہیں ہوتا۔ چناں چہ قومی سطح پر ان کے جو اخلاق دیکھنے میں آتے ہیں، بیش تر حالات میں ان کا مشاہدہ بین الاقوامی معاملات میں نہیں ہوتا۔ یہ مہذب قومیں اپنے اور اپنے حلیفوں کے لیے جو رویہ پسند کرتی ہیں وہی رویہ دوسری قوموں کے ساتھ اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ اس کا بنیادی سبب اسلام کے نزدیک خدا فراموشی اور خدا بے زاری ہے۔ جب تک انسان خدا کی مرضی کے سامنے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہوجائے اس کے اخلاق میں رفعت اور کردار میں بلندی نہیں پیدا ہوسکتی۔ جماعت اسلامی اسی روشنی میں ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر بے لاگ اظہار خیال کرتی ہے اور پوری یک سوئی کے ساتھ خدا کی عبادت اور اس کی کامل اطاعت کی دعوت دیتی ہے۔

اسلام سماجی زندگی میں عدل و انصاف، دیانت و امانت، صداقت و راستی، اخوت و مساوات، عقیدہ، مذہب اور اظہار خیال کی آزادی، رواداری اور عدم تعصب جیسی اخلاقی قدروں کا حامل ہے۔ یہی قدریں کسی سماج کو زندہ رکھتیں اور اس کے لیے ترقی کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔ جس سماج میں یہ قدریں پامال ہورہی ہوں وہ بہت جلد اپنی قوتِ حیات کھو بیٹھتا ہے اور موت سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ جماعت اسلامی ملک میں ان ہی پاکیزہ قدروں کو فروغ دینا چاہتی ہے، اسے وہ اپنا دینی و اخلاقی فرض اور ملک کی بہی خواہی تصور کرتی ہے۔

جماعت کی رفاہی سرگرمیاں

جماعت اسلامی اپنے اصول و نظریات کے معاملے میں کسی سمجھوتہ یا مداہنت کو صحیح نہیں سمجھتی اور ہر قیمت پر ان کی پابندی کو ضروری خیال کرتی ہے۔ اس لیے بہت سے لوگ اسے بنیاد پرست، فرقہ پرست، متعصب اور تنگ نظر جیسے القاب و آداب سے نوازتے رہتے ہیں۔ حالاں کہ جو شخص بھی جماعت کا دستور، اس کی پالیسی اور اس کے اب تک کے طرز عمل کا سنجیدگی سے مطالعہ کرے گا وہ اس طرح کے الزامات عائد کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔اس طرح کے بے بنیاد الزامات کی تردید، خدمت خلق کے ان کاموں سے بھی ہوتی ہے جو جماعت نے اب تک انجام دیے ہیں یا اب انجام دے رہی ہے۔ خدمت خلق کے ذریعہ وہ کوئی مادی یا سیاسی فائدہ حاصل کرنا نہیں چاہتی، بلکہ اسے وہ اپنا ایک مقدس اخلاقی اور مذہبی فرض سمجھتی ہے۔اس کے پروگرام میں ہر طبقہ کے کم زوروں ، معذوروں، محتاجوں ، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرنا داخل ہے۔ اس میں وہ کسی فرق و امتیاز کو روا نہیں رکھتی۔اس نے ملک کے مختلف حصوں میں ریلیف کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ کسی قسم کا تعصب نہیں برتتی۔ اس کے قائم کردہ دواخانوں اور اسپتالوں سے بلالحاظ مذہب و ملت سب ہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

جمہوریت کے بارے میں جماعت کا نقطۂ نظر

بعض لوگ جماعت کو جمہوریت (Democracy) کی مخالف سمجھتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ ایک پہلو سے جمہوریت کے تصور سے اختلاف رکھتی ہے تو دوسرے پہلو سے صاف الفاظ میں اس کی تائید کرتی ہے۔

جمہوریت میں اقتدار کا مرکز عوام ہوتے ہیں۔ ان ہی کو قانون سازی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ وہی یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ان کے لیے کون سا ضابطۂ حیات صحیح اور کون سا غلط ہے؟ صحیح اور غلط یا حق و باطل کے فیصلہ کا کلی اختیار وہ رکھتے ہیں۔ ان کے اقتدار کو سلب کرنے یا اس پر پابندی لگانے والی کوئی اور طاقت نہیں ہوتی۔ قانون سازی عملاً ان کے نمائندے کرتے اور نظم مملکت چلاتے ہیں۔

اسلام اس معنی میں جمہوریت کا قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ اسی کی ذات سرچشمۂ اقتدار ہے۔ قانون دینے کا اسی کو حق ہے۔انسان قانون ساز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون پر عمل کرنے اور اسے دنیا میں نافذ کرنے والا ہے۔ وہ اس حد تک آزاد ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ نے اسے آزادی عطا کی ہے اور ان حدود کا پابند ہے جن کا اسے اللہ نے پابند بنایا ہے۔ وہ اسی کی ہدایات کے تحت اپنے لیے اصول اور ضابطے وضع کرے گا اور اس کے قائم کردہ حدود کے اندر عمل کرے گا۔ اسلام کا یہ تصور آج کے تصور جمہوریت سے متصادم ہے، اس وجہ سے جماعت اسے غیر اسلامی سمجھتی ہے۔

جمہوریت کا یہ ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں مساوات اور عدل و انصاف کا تصور پایا جاتا ہے، اس کی رو سے ملک کے تمام شہری سیاسی ، سماجی اور قانونی حیثیت سے برابر کا درجہ رکھتے ہیں، حقوق شہریت سب کے یکساں ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ جمہوریت میں ملکی قانون کی بالادستی تسلیم کی گئی ہے اور اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس میں ہر فرد کو تحریر و تقریر کی، رائے اور خیال اور عقیدہ و مذہب کی آزادی حاصل ہے، کسی اجتماعی مقصد کے لیے جماعت بنانے اور تنظیم قائم کرنے کا شہریوں کو حق ہے۔ یہ سب باتیں اسلام کی تعلیمات سے ہم آہنگ ہیں۔ اس پہلو سے جماعت جمہوریت کی تائید کرتی ہے،

اور موجودہ حالات میں اسے ملک کے لیے بہتر اور موزوں طرزِ سیاست سمجھتی ہے۔

جمہوریت میں اختلاف رائے اور اس کے اظہار کا ہر فرد کو حق حاصل ہے۔ اس حق کے تحت جماعت اس کے اس تصور پر تنقید کرتی اور اسے غلط ٹھہراتی ہے کہ انسان کو خدا کی ہدایت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ملک کے عوام اقتدار کے مالک ہیں، وہ اپنی آزاد مرضی سے قانون سازی کر سکتے ہیں اور ان سے اوپر کوئی دوسرا اقتدار نہیں ہے۔

جمہوریت کا ایک بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ملک کے عوام پر کوئی نظریہ، کوئی فلسفۂ حیات اور کوئی طرز حکومت، زبردستی نہ مسلط کیا جائے، بلکہ یہاں جو بھی تبدیلی آئے عوام کی آزاد مرضی سے آئے۔ جماعت اسلامی اپنی جدوجہد میں اس اصول کی پوری طرح پابند ہے۔ چناں چہ اس کے دستور میں اصلاً قرآن و سنت کو اساسِ کار بتانے کے بعد کہا گیا ہے:

> ''جماعت اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابند ہوگی اور کبھی ایسے ذرائع اور طریقے استعمال نہ کرے گی جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کش مکش اور فساد فی الارض رونما ہو۔''

> ''جماعت اپنے نصب العین کے حصول کے لیے تعمیری اور پرامن طریقے اختیار کرے گی۔ یعنی وہ تبلیغ و تلقین اور اشاعت افکار کے ذریعہ ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔''

جماعت کی پالیسی میں یہی بات ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

''جماعت اسلامی ہند اپنے نصب العین کے حصول کے لیے کتاب اللہ

اور سنت رسول اللہؐ کی پابند ہے اور ان ہی کی ہدایات کے تحت اخلاقی، تعمیری، پرامن، جمہوری اور آئینی طریقے اختیار کرتی اور ایسے تمام طریقوں سے اجتناب کرتی ہے جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں اور جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کش مکش اور فساد فی الارض رونما ہوسکتا ہو۔''

''جمہوری و آئینی' کے مفہوم میں انتخابی سیاست میں حصہ لینا بھی شامل ہے۔ چنانچہ جماعت مناسب وقت پر اپنے اصولوں کے تحت الیکشن میں حصہ لے سکتی ہے۔''

جماعت اسلامی کے دستور اور اس کی پالیسی کے یہ الفاظ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ جماعت اپنے نصب العین اور مقصود کو حاصل کرنے کے لیے پرامن، اخلاقی، آئینی اور جمہوری طریقے اختیار کرتی ہے۔ فتنہ و فساد، توڑ پھوڑ اور منافرت جیسے گندے طریقے اس کے دستور، طریقۂ کار اور مزاج کے سراسر خلاف ہیں۔ ان ناپاک طریقوں کو وہ اسی وقت اختیار کرسکتی ہے جب کہ وہ اپنے پاک مقاصد سے دست بردار ہوجائے۔ اس کے لیے وہ کسی قیمت پر تیار نہیں ہے۔

(نومبر ۱۹۸۶ء)